نگارستان

مولانا ظفر علیخانؒ

پبلشرز یونائیٹڈ چوک انارکلی لاہور

باراوّل ۲۰۰۰

مجلد

للعہ/

(حرف سرورق آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپا)

فہرست

انتساب

ملّتِ بیضا کے حضور میں

کیونکہ

یہ مجموعۂ کلام اسی کے جذبات و نظریات کا آئینہ دار ہے

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

ظفر علیخاں

نگارستان

اگر شرمندۂ تعبیر میرا خواب ہو جائے
تو سارے ہند کا مشکل کشا پنجاب ہو جائے

مسلماں باندھ کر سر سے کفن آ جائیں میداں میں
تو دشمن جس قدر ہیں زہرہ سب کا آب ہو جائے

مسلمانوں کی یلغاریں کہیں روکے سے رکتی ہیں
سمندر بھی جو رستے میں پڑے پایاب ہو جائے

ہے خود اللہ ساقی ان مستوں کی محفل کا
ملے پانی بھی گر ان کو شرابِ ناب ہو جائے

فلسطیں کے مجاہد نے یہ اپنے جی میں ٹھانی ہے
مرے خونِ شہادت سے جہاں سیراب ہو جائے

اخوت اس کو کہتے ہیں کہ چبھے کانٹا جو کابل میں
تو دہلی کا ہر اک پیر و جواں بے تاب ہو جائے

وہ وقت آیا کہ نیل و دجلہ کی موجیں ملیں باہم
اور ان دونوں میں شامل لجۂ چناب ہو جائے

حکومت کا تقاضا ہے کہ حکمت ساتھ دے اس کا
کوئی بن جائے فارابی کوئی زریاب ہو جائے

"بہارستاں" کے بعد آئے "نگارستان" کی باری
تو مجموعہ مرے اشعار کا نایاب ہو جائے

(۱)

چراغِ کعبہ

عرب کا اور عجم کا ذرہ ذرہ جگمگا اُٹھا
جہاں میں روشنی پھیلی چراغِ کعبہ کی گھر گھر

جب اس کی تیل بتی کا نبیؐ خود کر گئے ساماں
بجھا سکتی ہے پھر کب اس دیئے کو کفر کی صرصر

یہاں الہام کی باتیں وہاں اوہام کی گھاتیں
اِدھر اسلام کی تکبیر اُدھر اصنام کی ہر ہر

رسولؐ اللہ کی اُمّت کی رنگا رنگیاں دیکھو
کہیں چینی کہیں ترکی کہیں ہندی کہیں بربر

سلام اُس پر کیا اس طرح ازبر جس نے قرآں کو
کہ جو کچھ سُن لیا جبرئیلؑ سے دُہرا دیا فر فر

ترے دروازہ کی چوکھٹ ہی یا رب اور یہ سر میرا
یہ سر جب ہو چکا تیرا تو پھر میں کیوں پھروں در در

مِرا خس پوش کاشانہ کہیں اچھا ہے راحت میں
اُس ایوانِ مشیّد سے جو ہے پروردۂ مرمر

(۲)

اُمّت کے حق میں

پیغمبرؐ کی دُعا

مسلّم ہے خدا کے بعد جس کی شانِ یکتائی　　ہے نام اُس کا محمدؐ ابنِ عبداللہ بطحائی

وہ جب آیا تو ساتھ اُس کے اک ایسا انقلاب آیا　　کہ ہیں اس وقت تک مہر و مہ و انجم تماشائی

وہ ساقی جس کی محفل کے لئے دوشِ ملائک پر　　خمستانِ ازل سے مے سبو میں سربمُہر آئی

وہ اُمّی کر دئے حل جس کی ابجد ناشناسی نے　　وہ نُکتے جن کو سمجھے تھے نہ اشراقی نہ مشائی

وہ آقا جس کی رحمت کی فراوانی کے دامن میں　　جہانِ اسود و احمر نے یکساں پرورش پائی

وہ مولا جس کے لطفِ بے نہایت کا یہ عالم تھا　　کہ تنگ اُس کے لئے تھی مشرق و مغرب کی پہنائی

بٹھایا انتم الاعلون کی مسند پر اُمّت کو　　مسلمانوں کے سر پر اُس نے رکھا تاجِ دارائی

ہم اب تک بھی اُسی کے ہیں مگر یہ کیا قیامت ہے　　کہ خود منظور ہم کو ہند میں ہے اپنی رُسوائی

علاج اس سارے نکبت کا ہے اک شے وہ دُعا اُس کی

اجابت کے لئے لازم ہوئی جس کی پذیرائی

یہاں تک لکھ چکا تھا میں کہ یثرب سے ندا آئی — یہ نابینا ہیں یارب مرحمت کر ان کو بینائی

عطا کر اگلے وقتوں کی بلندی ان کی ہمت کو — اور ان کے بازوؤں کو بخش پہلی سی توانائی

پرایوں کی غلامی سے انہیں آزاد کر یارب — بجے ان کی جبلی میں پھر آزادی کی شہنائی

بُرے ہیں یا بھلے ہیں پھر بھی یہ تیرے ہی بندے ہیں

مری اُمت ترے ہی کعبہ کی یارب ہے شیدائی



(۳)

ملّتِ بیضا کی دُعا

بدرگاہِ مجیب الدعوات

اپنی عزّت کا وہ خود کرتی تھی جب تک اہتمام
محترم تھی سب کے نزدیک اُمّتِ خیرالانام

سجدہ گاہِ مشرق و مغرب تھی اُس کی آستاں
اُس کے سر پر سایہ افگن تھا خدا کا لُطفِ عام

غیر کو ہونے نہ دیتی تھی کبھی گھر میں دخیل
آپ کرتی تھی وہ اپنے گھر کا سارا انتظام

اُس کی سطوت سے لرز جاتی تھی ساری کائنات
اُس کی عظمت کا ثریّا سے بھی اُونچا تھا مقام

اُندلس سے چین تک پہنچا لگا کر ایک جست
بارہا اُس کی عزیمت کا سمندِ تیز گام

یک بیک اسلام کا وہ کرّ و فر جاتا رہا
ہو گئی صبحِ وطن واحسرتا غربت کی شام

وہ الستی رشتہ ٹوٹا خود ہمارے ہاتھ سے
جو کبھی تھا برتر از اندیشہ ہائے انفصام

قولِ پیغمبر بنا سرمایۂ لہو الحدیث
قصّۂ پارینہ ٹھہرا ربِ اکبر کا کلام

جبر و استبداد کی چکی میں دنیا پس گئی ○ اب نہ وہ امن و اماں ہے اور نہ وہ صلح و سلام

سر سے پہلے کاٹ لی جاتی ہے ملت کی زباں ○ منہ پہ آتا ہے جو بھولے سے بھی آزادی کا نام

عمر جن کی ہے درازی میں صد و پنجاہ سال ○ لے رہی ہے قدرت ان کوتاہیوں کا انتقام

اپنے بندوں کی خطا کوشی کو یا رب بھول جا ○ اے کہ پہلے دن سے ہے تجھ کو خطا پوشی سے کام

ربنا افرغ علینا جرعے از مینائے خویش ○ آنکہ کافوراست روشن و آنکہ مشک است ختام

اپنے فیض لم یزل کے خم کے منہ کو کھول دے ○ خشک لب ہیں ہند کے رندان کو بھر کر دے وہ جام

جس کی اک جنبش بدل دے چرخ مینائی کا رخ

جس کی اک گردش پلٹ دے بزم عالم کا نظام



(۴)

پیغامِ بیداری

خدا کو نور کے تڑکے پکار لے مسلم
نکل کے گھر سے رہِ کوئے یار لے مسلم

نماز فرض ہے اس فرض سے نہ غافل ہو
بڑا یہ قرض ہے اس کو اُتار لے مسلم

ہے چند روزہ تری عمر اسے غنیمت جان
خدا کی یاد میں اس کو گزار لے مسلم

پکارتا ہے مؤذن کہ میٹھی نیند سے جاگ
اور اُٹھ کے عاقبت اپنی سنوار لے مسلم

صِلہ نماز کا تجھ کو خدا سے لینا ہے
تو بے حساب لے اور بیشمار لے مسلم

درود بھیج رسول خدا پہ رہ رہ کر
خدا کا نام لے اور بار بار لے مسلم

زمانہ نے تری عزت پہ ہاتھ ڈالا ہے
بحال کر کے یہ عزتِ قرار لے مسلم

نماز پڑھ کہ ملے تجھ کو سلطنت کی عروس
عراق و ہند و حجاز و تتار لے مسلم

جسے خود اپنی ہی غفلت سے کھو چکا ہی تو
پھر اپنے ہاتھ میں وہ اختیار لے مسلم

(۵)

متنبیٔ قادیاں کا ترانہ

رل گئے ہیں مجھے کچھ عقل کے اندھے ایسے — جن کی دولت سے مرا کیسہ[1] زر اپنا اشتہ ہی

دین کے پردہ میں دُنیا کو چھپایا میں نے — کہ اسی پردہ میں اچھی یہ مری داشتہ[2] ہی

---

[1] ہماری معاش اور آرام کا تمام مدار ہمارے والد صاحب کی محض ایک مختصر آمدنی پر منحصر تھا اور بیرونی لوگوں میں سے ایک شخص بھی مجھے نہیں جانتا تھا۔ اور میں ایک گمنام انسان تھا۔ جو قادیان جیسے ویران گاؤں میں زاویہ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ پھر بعد اس کے خدا نے اپنی پیشگوئی کے موافق ایک دُنیا کو میری طرف رجوع دے دیا اور ایسی متواتر فتوحات سے مالی امداد کی۔ کہ جس کا شکر بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ مجھے اپنی حالت پر خیال کر کے اس قدر بھی امید نہ تھی کہ دس روپیہ ماہوار بھی آئیں گے۔ مگر خدائے تعالےٰ جو غریبوں کو خاک سے اُٹھاتا اور متکبروں کو خاک میں ملاتا ہے اُس نے ایسی دستگیری کی کہ میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ اب تک تین لاکھ کے قریب روپیہ آچکا ہے اور شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ اگر میرے اس بیان کا اعتبار نہ ہو تو بیس برس کے سرکاری رجسٹروں کو دیکھو تا معلوم ہو کہ کس قدر آمدنی کا دروازہ اس تمام مدت میں کھولا گیا ہے۔ حالانکہ یہ آمدنی صرف ڈاک کے ذریعہ تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ ہزارہا روپیہ کی آمدنی اس طرح بھی ہوئی ہے کہ لوگ خود قادیان میں آکر دیتے ہیں اور نیز ایسی آمدنی جو لفافوں میں نوٹ بھیجے جاتے ہیں (حقیقۃ الوحی صفحات ۲۱۱ و ۲۱۲ شکم زادہ مرزا غلام احمد آں جہانی پیغمبر قادیاں)

[2] اگلے صفحہ پر۔

لیکن اس دین کی ہے یہ شرط کہ خوش ہو انگریز ۔ جس کا اقبال جہاں میں علَم افراشتہ ہے [۵۳]
کھا رہا ہوں غم بے مہرئ آقائے فرنگ ۔ سترہ سال سے یہ غم ہی مرا ناشتہ ہے [۵۴]

۵۲ میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار ہے (درخواست مرزائے آں جہانی بحضور لفٹنٹ گورنر بہادر مندرجہ "تبلیغ رسالت" جلد ہفتم صفحہ ۱۷)

۵۳ والد صاحب کے انتقال کے بعد یہ عاجز دنیا کے شغلوں سے علیحدہ ہو کر خدا کی طرف مشغول ہوا اور مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک نیز دوسرے بلاد اسلامیہ میں اس مضمون کے شائع کئے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے لہذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے اور دل سے اس دولت کا شکر گزار اور دعاگو رہے۔ اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں اردو فارسی عربی میں تالیف کر کے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کر دیں اور روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ اور بلاد شام اور مصر اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا اشاعت کر دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلط خیالات چھوڑ دیئے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔
یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں اس کی نظیر کوئی مسلمان نہیں دکھا سکتا (ستارہ قیصرہ" تصنیف مرزا غلام احمد پیغمبر قادیاں صفحہ ۳)

۵۴ پھر میں پوچھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے سرکار انگریزی کی امداد اور حفظ امن اور جہادی خیالات کے روکنے کے لئے برابر سترہ سال تک پورے جوش سے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سُوکھ جائے نہ کہیں میری نبوّت کا درخت
یہ وہ پودا ہے جو سرکار کا "خود کاشتہ" ہے

پوری استقامت سے کام لیا کیا اس کام کی اور اس خدمت نمایاں کی اور اس مدت دراز کی دوسرے مسلمانوں میں جو میرے مخالف ہیں کوئی نظیر ہے؟" (کتاب البریہ" اشتہار مؤرخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۹۷ء شکم زاد مرزائے آں جہانی) یا رہا بے اختیار دل میں یہ بھی گزرتا ہے کہ جس گورنمنٹ کی اطاعت اور خدمت گزاری کی نیت سے ہم نے کئی کتابیں مخالفت جہاد اور گورنمنٹ کی اطاعت میں لکھ کر دنیا میں شائع کیں اور کافر وغیرہ اپنے نام رکھوائے۔ اسی گورنمنٹ کو اب تک معلوم نہیں کہ ہم دن رات کیا خدمت کر رہے ہیں میں یقین رکھتا ہوں کہ ایک دن یہ گورنمنٹ عالیہ ضرور میری ان خدمات کی قدر کرے گی (اشتہار مرزائے آں جہانی مورخہ ۱۸۔ نومبر ۱۹۰۱ء مندرجہ "تبلیغ رسالت" جلد دہم صفحہ ۲۸)

۵۵ التماس ہے کہ سرکار دولت مدار...... اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم اور احتیاط اور تحقیق اور توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا خیال رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں (درخواست مرزائے آں جہانی بخدمت لفٹنٹ گورنر پنجاب مندرجہ "تبلیغ رسالت" جلد ہفتم صفحہ ۲۰)

(۶)

حجّتِ حق کا اتمام

آدم کی نسل پر ہوئی حجت خدا کی ختم
دنیا میں آج دین کی تکمیل ہو گئی

اپنا جواب آپ تھی جو آخری دلیل
افلاک پر حوالۂ جبریلؑ ہو گئی

بطحا میں رحمتِ دو جہاں کا ہوا ظہور
منشاءِ کردگار کی تعمیل ہو گئی

آکر محمدؐ عربی نے لگائی مُہر
اللہ کے قبالہ کی تسجیل ہو گئی

تورات کا فسانہ سُنانے کو رہ گیا
منسوخ اُس کے آتے ہی انجیل ہو گئی

پیشینیوں کی سلک میں دولت تھی جس قدر
اسلام کے خزانہ میں تحویل ہو گئی

ایماں کو جن سے شکوۂ اجمال تھا کبھی
قرآں میں اُن نکات کی تفصیل ہو گئی

سوتے ہوؤں کو اُس کی صدا نے جگا دیا
آواز اُس کی صورِ سرافیل ہو گئی

دنیا کی محفلوں کے دیئے سارے بجھ گئے
روشن جب اُس کی بزم کی قندیل ہو گئی

آفاق اعتدال کے سانچے میں ڈھل گیا
ارکانِ کائنات کی تعدیل ہو گئی

ہیبت سے کفر لرزہ بر اندام ہوگیا　　باطل کی روح خوف سے تحلیل ہوگئی

اصحابِ فیل ارضِ حرم سے ہوئے فرار　　ہر کنکری حجارۂ سجّیل ہوگئی

نقشہ زمیں کا چشم زدن میں بدل گیا　　اور ہیئت آسمان کی تبدیل ہوگئی

مرزائیوں کا نام ذرا دیر سے مٹا　　حق کے جلال سے یہی اک ڈھیل ہوگئی

میلادِ خواجۂ دوسرا کا ہے آج جشن
اور اُس کی مہتمم مری تخییل ہوگئی

(۷)

جبرئیلی ترانہ

ہماری مقدس روایات میں آیا ہے کہ ایک دن حضور سرورِ کون و مکان آیا تنا ہو دا اھا تنا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حلقہ میں جلوہ افروز تھے اور دعوت و ارشاد کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اتنے میں ایک اجنبی آیا اور کمال بے تکلفی سے حضورؐ کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گیا۔ اس اجنبی کا قد دراز، جسم سڈول، رنگ چمپئی تھا۔ سیاہ آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ حضورؐ سے مخاطب ہو کر بولا: "اے محمدؐ! بتا تو سہی احسان کسے کہتے ہیں؟" حضورؐ نے جواباً ارشاد فرمایا: "احسان یہ ہے کہ تو ربِ کعبہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔" جواب سُن کر اجنبی نے کہا صَدَقْتَ یعنی تو نے سچ کہا۔ پھر سوال کیا کہ "ایمان کیا ہے؟" حضورؐ نے فرمایا: "ربِ کعبہ کی عبادت اس انداز سے کہ گویا وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔" اس پر بھی اجنبی نے ازراہِ تحسین صَدَقْتَ کہا اور تیسرا استفسار یہ کیا کہ "اے محمدؐ بتا اسلام کسے کہتے ہیں؟" حضورؐ نے فرمایا: "اسلام یہ ہے کہ تو خدا کو ایک سمجھے اور اُسی سے لَو لگائے، پانچ وقت کی نماز پڑھے۔ سال بھر میں تیس روزے رکھے۔ ڈھائی فیصدی زکوٰۃ دے اور عمر بھر میں کم سے کم ایک مرتبہ حج کرے۔" یہ جواب باصواب سُن کر اجنبی نے حسبِ معمول صَدَقْتَ کہا اور سلام عرض کر کے رُخصت ہوا۔ حضور سرورِ کون و مکان نے صحابہ سے پوچھا: "جانتے ہو یہ کون شخص تھا؟" اُنھوں نے بیک زبان عرض

کی کہ خدا اور خدا کا رسول ہی بہتر جانتا ہے، ہم نے تو آج تک اس اجنبی کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ جبریلِ امین تھے۔ اس تمہید کے بعد ذیل کے ترانہ کی حقیقت صحیح طور پر معلوم ہو گی:۔

احسان کا ہنڈا ہاتھ میں لے ایمان کا جھنڈا ہاتھ میں لے
اسلام کا ڈنڈا ہاتھ میں لے پھر ساری یہ دُنیا تیری ہے
ہنڈے کو حریمِ جاں میں جلا جھنڈے کو کلیساؤں پہ اُڑا
ڈنڈے کو بُتوں کے سر پہ گھما پھر ساری یہ دُنیا تیری ہے
پڑتا ہو جہاں گھمسان کا رن باندھے ہوئے چل شمشیر و کفن
کر زندہ عرب کی رسمِ کہن پھر ساری یہ دُنیا تیری ہے
ڈرنا ہے تو ایک اللہ سے ڈر مرنا ہے تو اُس کی راہ میں مر
اِس نکتہ کو رکھ لے پیشِ نظر پھر ساری یہ دُنیا تیری ہے
غیروں میں نہ مل اپنوں سے نہ کٹ اُن کو نہ بڑھا اور آپ نہ گھٹ
فرقوں میں نہ بٹ مرکز سے نہ ہٹ پھر ساری یہ دُنیا تیری ہے
مت بھول کفن بردوش ہے تُو بطحا کے جنوں کا جوش ہے تُو
اس جوش میں گر مدہوش ہے تُو
پھر ساری یہ دُنیا تیری ہے

(۸)

پھولوں کا تار بلبل کے نام

گجرِ دم بلبلوں کے نام پھولوں کا یہ تار آیا
کہ رخصت ہو گئی فصلِ خزاں عہدِ بہار آیا

نسیم اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گزری خیاباں سے
اور اس کے پیچھے پیچھے ابرِ مروارید بار آیا

طیورِ صبح خواں کا نغمہ گونجا شاخساروں میں
وہ نغمہ جس کو سن کر جانِ مضطر کو قرار آیا

زمیں پر آسماں کی رحمتیں اتریں صف اندر صف
خدا کے فضل کا لشکر قطار اندر قطار آیا

پرستارانِ خاکِ کعبہ کی قسمت چمک اٹھی
نئی تقدیر کے سانچے میں ڈھل کر روزگار آیا

جہاں کا نقشہ بدلا مصطفےٰ کی ترکتازی نے
عرب کے صحرا اول کا جنوں بر روئے کار آیا

بقدرِ منزلت بخشی گئی آزار کی لذّت
مسلمانوں کے حصّے میں دو عالم کا فشار آیا

مری مشکل کو دنیا میں نہ آساں کر سکا کوئی
مصیبت میں جو کام آیا مرا پروردگار آیا

نہ کیوں رشک سے جبریلِ امیں چومے زباں مری
کہ محبوبِ خدا کا نام اس پر بار بار آیا

وہ اُمّی جس نے اُمّت کو حیاتِ سرمدی بخشی
وہ پیغمبر جو ہو کر شافعِ روزِ شمار آیا

(۹)

جوئندہ یابندہ

سُورج کو جس کے نُور نے رخشندہ کر دیا
موتی کو جس کی آب نے شرمندہ کر دیا

اپنے کرم کو آپ ہی جوئندہ کر دیا
پھر میری احتیاج کو یابندہ کر دیا

آدم کے سر کو بخش دیا تاجِ کائنات
اُس کے اس افتخار کو پایندہ کر دیا

اسلام کے سپرد ہُوا جس کا اہتمام
اُس کارخانہ کا مجھے کارندہ کر دیا

جس میں کوئی تمیز نہیں رنگ و نسل کی
اُس سرزمین کا مجھے باشندہ کر دیا

ہوتا ہے جن میں نامِ رسولِ خدا بلند
اُن محفلوں کا مجھ کو نمایندہ کر دیا

سرکارِ دو جہاں کا بنا کر مجھے غلام
میرا بھی نام تا بہ ابد زندہ کر دیا

اِس زندگی کے فیض نے ہندوستان میں
باطل کی قوتوں کو پراگندہ کر دیا

(۱۰)

نغمۂ فارابی

(۱۰)

بہ رہا ہے دجلہ گلناروں میں لہراتا ہوا　　پھیلتا دبتا سمٹتا پیچ و خم کھاتا ہوا

یاد جس کی موج سے ہے تازہ المنصور کی　　گردنیں جس نے جھکا دیں قیصر و فغفور کی

نقش ہے ساحل پہ اُس کے نامِ ہارون الرشید　　جس کی ہر شب تھی شبِ قدر اور ہر دن روزِ عید

زینتِ بزمِ تمدن رونقِ بغداد ہے　　علم و فضل و دانش و حکمت یہاں آباد ہے

بابِ اول ہے کتابِ فضل المامون کا　　وہ جو قصہ ہے ارسطو اور افلاطون کا

برمکی فیاضیاں صرفِ گہرباری ہوئیں　　سیم و زر کی ندیاں چاروں طرف جاری ہوئیں

ایسی ایسی فلسفہ نے کیں یہاں گلکاریاں　　خاک میں سب مل گئیں یونان کی خودداریاں

مصر و ایراں کے تمدن کا فسانہ رہ گیا ○ اُڑ گئے طائر اُجڑ کر آشیانہ رہ گیا

نام وہ چمکا بنی عباس کا آفاق میں　　ماند ہے خورشید انور لاجوردی طاق میں

○ ایشیا میں پڑ رہی ہے آج اُن افسانوں کی دھوم

کانپتا یورپ میں اُن کے نام سے ہے "کلبِ روم"[۱]

[۱] نقفور (نائی سی فورس) قیصر روم نے خلیفہ ہارون الرشید کو ایک گستاخانہ خط لکھا تھا۔ ص

(۲)

آچلا افسوس عباسی خلافت پر زوال ۔ اب نہ وہ اگلی سی سطوت ہے نہ پہلا سا جلال

قصرِ دولت کو تزلزل کا پیام آنے کو ہے ۔ اس عمارت کا ستوں مرکز سے ہٹ جانے کو ہے

جوشِ فرزندانِ عمِ مصطفےٰ کا سرد ہے ۔ عورتوں کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہر مرد ہے

مملکت کی کس کو خواہش سلطنت کا کس کو ہوش ۔ رات دن ہے صحبتِ شاہد میں شغلِ نا و نوش !

علم رخصت ہو چکا تلوار میں زنگ آچلا ۔ آسماں عباسیوں کی وضع سے تنگ آچلا

کوئی دم میں یہ بساطِ کہنہ اُلٹے گا فلک ۔ جس میں کچھ کچھ ہے نمایاں دورِ اول کی جھلک

جل چکی رسی مگر ہے بل ابھی تک برقرار ۔ اب بھی ہیں اس راکھ میں پوشیدہ تھوڑے سے شرار

پاتے ہیں دربار میں بار اب بھی آکر علم و فن ۔ اب بھی اس چرچے سے کچھ خالی نہیں یہ انجمن

ذیل میں جو دل نشیں قصہ سپردِ خامہ ہے

وہ انہی وقتوں کی یادِ گرمیٔ ہنگامہ ہے

(۳)

طرفِ دریا نصب ہے اک شامیانہ زرنگار ۔ جھمجھماتی ایک مسند جس میں دیتی ہے بہار

۵ ہارون الرشید نے جواب دیا کہ اے رومی کُتے تو اپنے خط کا جواب سُنے گا نہیں بلکہ دیکھ لے گا۔ چنانچہ قشونِ قاہرہ خلافت نے قیصر کے علاقہ میں برق و باد کی طرح پہنچ کر فریجیا کے میدانوں میں اُسے ایسی سخت شکست دی کہ صفحہ تاریخ پر یہ واقعہ ہمیں ابھی تک خون و آتش کے حروف میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔

جلوہ گر ہیں قلبِ مسند پر امیر المومنیں — حضرتِ خاقانِ اعظم ماٗمنِ دُنیا و دیں
خطبۂ دُنیا میں پڑھا جاتا ہی جن کے نام کا — کیونکہ مرکز سمجھے جاتے ہیں یہی اسلام کا
گرچہ اجزائے خلافت ہو چکے ہیں منتشر — ہے اثر اُن کی ارادت کا مگر ہر قلب پر
خاص خاص اعیانِ دولت زینتِ دربار ہیں — کچھ عرب کچھ ترک کچھ تاجیک کچھ تاتار ہیں
حاجبِ دربان قرینہ سے کھڑے ہیں سامنے — باندھ رکھی ہیں صفیں آداب کی خدام نے
جمع ہیں دربار میں کچھ فلسفی اور کچھ فقیہ — کچھ سخنور بذلہ سنجی کر رہے ہیں فی البدیہہ
فخر کا موجب روایت ہے کسی کے واسطے — ناز کا باعث درایت ہے کسی کے واسطے
فلسفی کہتے ہیں اُن کا عروۃ الوثقیٰ ہی عقل — اور فقیہوں کے لئے حبل المتیں بنتی ہے نقل

باتوں باتوں میں غرض رنگ اک نیا لاتی ہی بحث
حلت و حرمت پہ موسیقی کی چھڑ جاتی ہی بحث

(۴)

ایک کہتا ہی غنا مذہب میں جائز ہی نہیں — نغمہ بدعت ہی مسلماں جس سے فائز ہی نہیں
ایسی محفل ہے خلافِ شرع جس میں راگ ہو — خرمنِ ایماں کے حق میں جس کی ہر تان آگ ہو
دوسرا کہتا ہی موسیقی سے ہی لطفِ حیات — ہے شرابِ نغمہ سے لبریز جامِ کائنات
مسجدوں میں غلغلہ ہے رتلِ القرآن کا — شور افسانوں میں ہے داؤد کے الحان کا
تیسرا کہتا ہی گر رکھتے ہو گوشِ حق نیوش — کیوں نہیں سُنتے پکارے سب میں کہتا ہی سروش

راگ بھر کر اپنے باجے ہیں اگر لائی نہ ہو — محفلِ قدرت کی یہ ہنگامہ آرائی نہ ہو

پھول پر بھونرے کی گونج امبر پہ بادل کی گرج — سازِ قدرت کے یہ سُر ہیں ایک پنچم اک کھرج

امتیازِ فعل و قوت کا جو نکلے دل سے چور — گلستانوں سے نہیں کچھ کم نیستانوں میں شور

میٹھے نغموں پر جو غش ہوتا نہ خود ربِّ قدیر

انکر الاصوات کیوں ہوتی بھلا صوت الحمیر

(۵)

اس دل آرا بحث کو سب لگ گئے سننے بغور — دفعتہً دربار کا لیکن بدل جاتا ہے طور

یک بیک آتی ہے جنبش میں صف پائیں جہاں — آگے بڑھنا چاہتا ہے ایک نو وارد جواں

صوفیانہ وضع ہے پُر تمکنت انداز ہے — ہاتھ میں اُس کے انوکھی وضع کا اک ساز ہے

اُس کی آنکھوں میں بھرا ہے جذبہ مقناطیس کا — سن یہی ہوگا کوئی بتیس[۳۲] یا تینتیس[۳۳] کا

ہوتی ہے اُس نوجواں کی ظاہر اب افسونگری — ساز ہے گو سالہ اُس کا اور وہ خود ہے سامری

ساز چھڑتا ہے تو ہوتا ہے گمانِ دربار کو — یہ جواں شاید پکڑ لایا ہے موسیقار کو

انگلیاں اُس کی جو صرفِ پردہ ہائے ساز ہیں — خازنِ گنجینۂ نقدِ نوائے راز ہیں

اُس کی ہر گت میں کچھ ایسا اُس نے پھونکا ہے فسوں — سننے والوں کی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے خوں

خود مگر اس وقت تک یہ نوجواں خاموش ہے — ساز ہی اُس کا فقط دزدِ متاعِ ہوش ہے

ساز سے خود بھی ملاتا ہے وہ اب آواز کو — زندہ کرتا ہے شبیہِ پیکرِ اعجاز کو

نور کا اس شخص کو قدرت نے بخشا ہے گلا
جس کی تانوں سے فضا میں جلوہ آرا ہی ملا

اُس کی ہر اک گٹکری ہے ہالۂ جرمِ قمر
پڑ رہا ہے یا مگر جادو کے دریا میں بھنور

اُس کی تانیں ہیں رسیلی اور ترانے جاں نواز
دلگدازی میں ہیں لیلیٰ، دل نوازی میں ایاز

اہلِ محفل کو سناتا ہے کہانی نجد کی
جس سے ہو جاتی ہی حالت سب پہ طاری وجد کی

مست ہو کر جھومنے لگتی ہے ساری انجمن
لوحۂ ادراک سے مٹتا ہے نقش ما و من

دیکھ کر یہ حال جس سے محوِ حیرت ہوں ملک
نوجواں کے لب پہ آتی ہی تبسم کی جھلک

لکھ کے اک پرچہ پہ کچھ مسند پہ دیتا ہی وہ ڈال
پھر وہ چپکے سے چلا جاتا ہی پھیلا کر یہ جال

—————(۶)—————

برف میں ڈوبی ہوئی ہی سارے کشور کی ہوا
ایک جھونکے میں وہ سب سوتوں کو دیتی ہی جگا

سب سے پہلے کھول لیتے ہیں آنکھ امیر المومنیں
رنگِ محفل دیکھ کر ابرو پہ آجاتی ہے چیں

نوجواں سازندہ کا لیکن جب آتا ہے خیال
غور کرتے ہیں کہ جو اپنا وہی اوروں کا حال

پوچھتے ہیں وہ مغنی کون تھا اور ہے کہاں
کوئی بھی لیکن بتا سکتا نہیں اُس کا نشاں

اتفاقاً آپ کی پرچہ پہ پڑتی ہے نظر
جس سے کھلتی ہی معمے کی حقیقت سر بسر

پرچۂ کاغذ پہ تھا صرف اس قدر لکھا ہوا
اے خلیفہ یہ عمل بو نصر فارابی کا تھا

(۱۱)

ہرمزان

اہلِ مغرب اور اُن کی دیکھا دیکھی مشرق کے بعض حلقے مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہوئے سُنے جاتے ہیں کہ اسلام اگر دُنیا میں پھیلا ہے تو اپنی سچائیوں کی بدولت نہیں بلکہ محض تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ اقوامِ عالم کو اس کی صداقتوں نے مسخر نہیں کیا بلکہ اس خوف نے مسخر کیا ہے کہ محمدؐ کا کلمہ نہ پڑھا تو گردن اُڑا دی جائے گی۔

جہالت اور تعصب نے نکتہ چینیوں سے انصاف کی توفیق بالکل ہی چھین نہ لی ہوتی تو پروفیسر آرنلڈ کی طرح اُنہیں ماننا پڑتا کہ اسلام پر بزورِ شمشیر پھیلنے کا الزام قطعاً بے بنیاد ہے۔ اس کی حیرت انگیز ترقی کا راز فقط اُس کی اعلیٰ اخلاقی تعلیم میں مضمر ہے مسلمان دیکھتے دیکھتے دُنیا کے بڑے حصے پر اس لئے چھا گئے کہ انہوں نے خدا کو پہچانا، خدا کے بندوں کے مرتبہ کو پہچانا نسل و رنگ کے امتیاز پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ عرب و عجم کی تمیز اُٹھا دی۔ گورے کالے کی تفریق مٹا دی۔ بنی آدم کو آزادی مساوات اور اخوت کا درس دیا۔ انصاف کو اپنوں اور پرایوں کے لئے عام کر دیا۔ پابندیٔ عہد کو شرفِ انسانی کا لازمہ قرار دیا۔ غیر قوموں کے افراد جب مسلمانوں کو ان اوصاف سے متصف پاتے تھے تو دل سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ اس تاریخی حقیقت کے ثبوت میں ان گنت مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں اسلام کے خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضؓ کے عہد کا صرف ایک واقعہ بیان کر کے یہ جتانا مقصود ہے کہ ایران کا سپہ سالار ہرمزان کس طرح اسلام لایا۔

ہرمزان عرب سے اول اول کسریٰ پرویز کے عہد میں روشناس ہوتا ہے نعمان ابن منذر

تاجدار حیرہ کو پرویز نے مسیحیت قبول کرنے کی پاداش میں، یا کسی اور علت میں گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اور وہ قید ہی میں مرگیا۔ نعمان نے اپنا اسلحہ خانہ اور سارا ساز و سامان جنگ قبیلۂ بکر کے سردار ہانی کے سپرد کر دیا تھا۔ پرویز نے یہ سامان ہانی سے طلب کیا۔ اُس نے انکار کیا۔ اس پر پرویز نے ہرمزان کو دو ہزار فوج کے ساتھ ہانی سے سامان مطلوبہ جبراً وصول کرنے کی خدمت پر مامور کیا۔ سارا قبیلۂ بکر ذی قار میں اپنی پوری فوجی قوت کے ساتھ جمع ہوا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ اور ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جنگ میں بنفسِ نفیس موجود تھے۔ جب پانسہ ایرانیوں کے خلاف پلٹنے لگا تو حضورؐ نے فرمایا کہ آج عرب نے پہلی مرتبہ ایران سے اپنی ذلتوں کا بدلا لیا ہے۔

جنگِ قادسیہ میں جس کے علمدار سعد ابن وقاص تھے ایرانی سپہ سالار رستم کو فاش شکست ملی۔ رستم میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ ایرانی فوج میں بھاگڑ پڑ گئی۔ کچھ افسر جن میں ہرمزان بھی تھا اس حالت میں داد ثابت قدمی دے کر لڑتے رہے لیکن مسلمانوں نے ایک ایسا جاں ستاں حملہ کیا کہ ہرمزان اور اُس کے ساتھیوں کو راہ فرار اختیار کرتے ہی بنی۔

قادسیہ میں شکست کھا کر ایرانیوں نے بابل میں قدم جمائے۔ سعد نے اُن پر چڑھائی کی۔ اور بابل میں ایک بہت بڑا معرکہ ہوا۔ ایرانی فوج گراں کے ایک جیش کا سپہ سالار ہرمزان تھا مسلمانوں نے کچھ اس بے جگری سے حملہ کیا کہ ایرانیوں کے پاؤں حسب معمول اُکھڑ گئے۔ اور مسلمانوں نے میدان مار لیا۔

اس کے بعد ایرانیوں کو مختلف میدانوں میں مسلسل اور متواتر شکستیں ملتی رہیں تا آنکہ ابوموسیٰ اشعری نے جو حاکم بصرہ تھے خوزستان کے وسیع ایرانی صوبہ پر فوج کشی کی۔ ہرمزان نے یزدجرد کو اپنی خدمات اس شرط پر پیش کیں کہ اگر مجھے اہواز اور فارس (خوزستان) کی صوبہ داری مرحمت ہو تو میں عربوں کی پیش قدمی کا سد باب کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اس منصب پر فوراً اُسے سرفراز کیا گیا۔ خوزستان کا صدر مقام شوستر تھا۔ ہرمزان نے یہاں کے قلعہ کو

مستحکم کیا اور فوجیں جمع کرنی شروع کیں ۔طول و عرض کشور میں اپنے نقیب روانہ کئے جنہوں نے حُب وطن کے جذبہ کے نام پر لوگوں سے فوج میں بھرتی ہونے کی اپیلیں کیں۔ اس طور پر ایک بہت بڑا لشکر جمع ہو گیا ۔ بصرہ سے مسلمانوں کو کمک دینے کے لئے جو دستہ فوج آیا وہ تھا وہ تعداد میں قلیل تھا۔ ہرمزان نے فوج کی کمانداری کے فرائض خود انجام دئے ۔ اور بڑی بہادری سے لڑا۔ دو جلیل القدر مسلمان افسر اُس کے ہاتھوں کھیت رہے لیکن با ایں ہمہ فتح مسلمانوں کی ہوئی۔ ایک ہزار ایرانی قتل ہوئے اور چھ سو قید کر لئے گئے ہرمزان قلعبند ہو گیا اور جنگ جاری رہی ۔ ابو موسیٰ اشعری نے قلعہ کا محاصرہ کیا مگر قلعہ ایک عرصہ تک سر نہ ہوا ۔

ایک دن شوستر کے ایک شہری نے ابو موسیٰ کے پاس آکر شہر میں داخل ہونے کا ایک خفیہ رستہ بتایا اور ایک عرب اشرس کو ساتھ لے لیا جو رات کے وقت شہری کی راہ نمائی میں اُس راستہ سے داخل شوستر ہوا اور ہرمزان کے محل تک پہنچ گیا جہاں ہر طرح کے خطرہ سے غافل ہرمزان اپنے درباریوں کے بیچ میں بیٹھا داد عیش دے رہا تھا اور شراب اور غوانی کا دور چل رہا تھا۔ اشرس نے واپس جا کر ابو موسیٰ اشعری کو یہ ساری کیفیت کہہ سنائی اور دو سو کار آزمودہ سپاہیوں کا دستہ ہمراہ لے کر قلعہ کے دروازہ تک پہنچ گیا خفیہ رستہ سے اندر داخل ہو کر اُنہوں نے پاسبانوں کو قتل کر دیا اور شہر پناہ کا پھاٹک کھول دیا ۔ ابو موسیٰ باہر اسی موقع کا منتظر تھا۔ پھاٹک کھلتے ہی سارا اسلامی لشکر شہر کے اندر داخل ہو گیا۔

ہرمزان نے ایک برج میں پناہ لی اور پکارا کہ میری ترکش میں ایک سو تیر ہیں جب تک اتنے ہی مسلمانوں کی لاشیں تڑپتی ہوئی نظر نہ آئیں گی میں گرفتار نہ ہو سکوں گا لیکن میں اس شرط پر برج سے نیچے اُترتا ہوں کہ مجھے مدینہ پہنچا دیا جائے ۔میری نسبت عمرؓ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔ ابو موسیٰ نے یہ تجویز منظور کر لی اور ہرمزان کو اُس کے لاؤ لشکر اور بھیڑ بنگاہ سمیت حضرت انس کی معیت میں جن کا بھائی میدان جنگ میں ہرمزان کے ہاتھوں شہید ہوا تھا دارالخلافہ کی طرف روانہ کر دیا ۔

مدینہ میں ہرمزان اور اُس کے سارے کنبہ کا داخلہ بڑے شان وشکوہ اور طمطراق سے ہُوا اُس کے جلو میں ایران کے متعدد نامور سردار تھے جن کے زرق برق کے لباس آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہے تھے۔ وہ خود ایرانی تہذیب کے تجمل کی چلتی پھرتی مورت بنا ہُوا تھا۔ سر پہ ایک مرصع تاج تھا۔ حریر کے ایک پُرتکلف لبادے نے جس میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے اُس کے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کمر میں ایک خنجر جونہ نگار حمایل تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کسروانی دولت وحشمت کی اس نگاہ کو خیرہ کرنے والی نمائش سے وہ عربوں کو مرعوب کر سکے گا۔ پایۂ تخت میں داخل ہوتے ہی اُس نے لوگوں سے پوچھا کہ امیرالمومنین کہاں ہیں؟ وہ یہ سمجھتا تھا کہ جس شخص کے نام کا ڈنکا دُنیا میں بج رہا تھا اور جس کے نام کی ہیبت سے مشرق ومغرب تھر تھر کانپ رہے تھے اُس کا دربار بھی نرالے ٹھاٹھ کا ہوگا لیکن اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے ایک شخص کو مسجدِ نبوی کے صحن کی خاک پر بیٹھے دیکھا اور لوگوں نے اُسے بتایا کہ عمر فاروق یہی ہیں۔

حضرت فاروق اعظم نے عجمی تکلفات کے اس پیکرِ متحرک پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالی۔ جنگ قادسیہ کے بعد ہرمزان نے متعدد بار اپنے عہد کی خلاف ورزی کی تھی اور سعد ابن وقاص سے جتنے معاہدے کئے تھے سب کو نہایت شوخ چشمی سے توڑا تھا جو اسلام کے نزدیک ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ اس کے علاوہ معرکۂ شوستر میں دو جلیل القدر اسلامی سردار اُس کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ اُس کی ان ساری حرکتوں سے حضرت عمر بے حد برہم تھے اور آپ اُس کی گردن کو تیغۂ جلاد کے حوالے کر دینے کا عزم راسخ فرما چکے تھے لیکن انصاف متقضی تھا کہ اتمام حُجت کے طور پر اُسے صفائی کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ اُس کو اجازت دی گئی کہ اپنی روش کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے جو کچھ کہنا ہے کہہ لے۔

ہرمزان نے کہا کہ اے عمر جب تک خدا ہمارے ساتھ تھا تم لوگ ہمارے غلام تھے۔ اب خدا تمہارے ساتھ ہے اس لئے ہم تمہارے غلام ہیں۔ پھر کہا کہ یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرے قتل کا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن میں سخت پیاسا ہوں۔ شدت تشنگی سے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے ہیں۔ لب تر کرنے کو پانی کا ایک گھونٹ مل جائے تو جان ذرا اطمینان سے نکلے۔ اس کی یہ خواہش پوری کی گئی۔ اور پانی کا ایک بھرا ہوا پیالہ اُسے لاکر دیا گیا پیالہ ہاتھ میں لے کر اس نے تھوڑا سا تامل کیا اور کہا کہ جب تک میں پانی پی نہ لوں مجھے قتل نہ کیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم نے اس کی یہ التجا قبول کر لی اور اُسے اطمینان دلایا کہ جب تک وہ اپنی پیاس پانی کے اس پیالہ سے بجھا نہ لے گا اس کی گردن نہ ماری جائے گی۔ ہرمزان نے پانی کا آبخورہ فوراً زمین پر پٹک دیا اور کہا کہ میں پانی نہیں پیتا اور پیالہ میں وہ پانی ہی نہیں رہا جسے پیوں۔ اب آپ مجھے اپنے قول کے مطابق قتل نہیں کر سکتے۔ حضرت عمر کے اصول ایفائے عہد کے پاس اس منطق کی بے پناہی کا کوئی جواب نہ تھا۔

اس کے بعد ہرمزان نے بطیب خاطر کلمہ شہادت پڑھا اور اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمداً عبدہٗ و رسولہ کہہ کر اپنے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں اسلام کے فضائل کا ایک عرصہ سے معترف تھا اور دل سے اس کی حقانیت پر ایمان لا چکا تھا۔ پانی سے پیاس بجھانے کا حیلہ میں نے صرف اس لئے اختیار کیا کہ لوگ کہیں مجھے یہ طعنہ نہ دیں کہ موت کے ڈر سے میں نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا ہے۔

ہرمزان کے اس اعلان سے حضرت فاروق اعظم کے دل میں مسرت کی ایک گونا گوں لہر دوڑ گئی۔ وہ اب آپ کا دست و بازو تھا۔ اور آپ نے اس کے لئے تاحین حیات دو ہزار دینار سالانہ کا منصب مقرر فرما دیا۔

اس دل کشا تاریخی واقعہ کو میں نے نظم کا لباس پہنایا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

وہ تیغ جس کی چمک برقِ طور کی مانند ۔۔۔ بنی تھی روشنیٔ دیدۂ جہاں کے لئے
چلائی سعد نے جب قادسیہ میں آکر ۔۔۔ قدسیوں نے قدم چومے تیغ راں کے لئے
اس ایک فتح نے ایران کو کیا تسخیر ۔۔۔ رہی نہ کوئی کمیں دودۂ کیاں کے لئے
اثر یہ تھا اسی فتح الفتوح کا کہ زمیں ۔۔۔ ہوئی تھی تنگ عجم کے خدائگاں کے لئے
بدل رہا تھا زمانہ کا اور زمیں کا رنگ ۔۔۔ کہ مشغلہ ہے پرانا یہ آسماں کے لئے
زوالِ دولتِ پرویز ٹل نہ سکتا تھا ۔۔۔ سکوں محال ہو گنبد پہ گردگاں کے لئے
جھکائی جا رہی تھی یزدجرد کی گردن ۔۔۔ موحدینِ عرب کے علوِ شاں کے لئے
مقاومت کے دکھائے عدو نے گر جوہر ۔۔۔ یہ فخر وقف تھا بانیٔ ہرمزاں کے لئے
گئی عجم کی غنیمت مدینہ کو جس وقت ۔۔۔ کہ منتظر تھا وہ اس گنج شایگاں کے لئے
تو ہرمزان کے بارہ میں سعد نے لکھا ۔۔۔ بلا یہ ایک ہی اسلامیوں کی جاں کے لئے
جفا نہیں کوئی ایسی روا نہیں جو ہوئی ۔۔۔ عجم کے اس ستم اندوز قہرماں کے لئے
قبا ہی اس کی مسلماں کے خون سے رنگیں ۔۔۔ کفن بنی ہی جو آج اس کے خانداں کے لئے
ہوا جلالِ عمر کا یہ فیصلہ اس پر ۔۔۔ سزائے موت ہی اس دشمنِ اماں کے لئے
یہ ہرمزان پکارا میں تشنہ ہوں پہلے ۔۔۔ بجھاؤ پیاس مری ربِّ مہرباں کے لئے
دیا گیا جب اسے آبخورہ پانی کا ۔۔۔ تامّل اس نے کیا شاید امتحاں کے لئے

تسلی اُس کو خلیفہ نے دی یہ فرما کر | زباں ہو قول کو اور قول ہو زباں کے لئے
نہ تیرے حلق سے جب تک اُتر لے یہ پانی | حرام خوں ہے ترا خنجر رواں کے لئے
جو میہماں ہو عدو بھی تو احترام اُس کا | ہمارے کیش میں لازم ہے میزباں کے لئے
پٹک کر اُس نے پیالہ کہا کہ خوف سے اب | ملی نجات مجھے عمر جاوداں کے لئے
امان مل گئی مجھ کو ہے فرض عہد کا پاس | حریم احمد مرسل کے پاسباں کے لئے
مری جبین کے سجدوں میں تھی ازل سے تڑپ | حضور خواجۂ کیہاں کی آستاں کے لئے
نہ کر سکا مگر اقرار اس حقیقت کا | خودی حجاب تھی اقرار باللساں کے لئے
میں خوف قتل سے مذہب اگر بدل دیتا | تو لوگ کہتے یہ حیلہ ہے حفظ جاں کے لئے
مگر خود اپنی خوشی سے میں اب یہ کہتا ہوں | بنا ہے آج سے اسلام ہرمزاں کے لئے

بجلیم اشہد ان لا الٰہ الا اللہ
جگہ بہشت میں نکلی مرے مکاں کے لئے

(۱۲)

رامائن کا ایک سین

ایک رشی کے داغِ جگر کی کہانی راجہ جسرتھ کی زبانی

(۱)

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی — تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی

آفتاب اوڑھے ہوئے تھا چادرِ ابرِ سیاہ — برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ

بادل اتنے میں دُرِ ناسفتہ برسانے لگا — داستانِ قلزم و عمّاں کو دُہرانے لگا

جھوم کر اُٹھی گھٹا، برسی، برس کر چھٹ گئی — گرد کی چادر زمیں کے منہ سے فوراً ہٹ گئی

بادلوں سے نورِ خورشید اُس طرف چھننے لگا — سائباں قوسِ قزح کا اس طرف تننے لگا

سبزہ زاروں میں کلیلیں کرتے پھرتے تھے ہرن — تھا جہاں بن کا ہر اک گوشہ ختن اندر ختن

جنگلوں میں مست ہو کر ناچتے پھرتے تھے مور — کوہساروں میں چکوروں نے مچا رکھا تھا شور

ڈھل کے پہنچا تھا افق کی آستاں تک آفتاب — تھا شفق کا اس کے منہ پر ایک نارنجی نقاب

(۲)

بینش آرا یہ مناظر تھے کچھ ایسے دل فریب — ہاتھ سے جاتا رہا دل میرا اور دل سے شکیب

عالم از خود رفتگی کا مجھ پہ طاری ہو گیا — جوش مستی کا مری رگ رگ میں ساری ہو گیا

جی میں آیا میرے رہ رہ کر یہی بے اختیار — گھر سے نکلوں جا کے جنگل میں کروں سیر شکار

ہاتھ میں ترکش لئے کاندھے پہ لٹکائے کماں — میں چلا بن کی طرف گھر سے نکل کر شادماں

پڑ رہی تھی ہر طرف میری تجسس کی نظر — تاک میں تھا میں کہ شاید کوئی پیاسا جانور

گھاٹ پر جاتا ہو پیاس اپنی بجھانے کے لئے — اور بنے آماج گہ میرے نشانے کے لئے

دفعتاً ندی سے قلقل کی صوت پیدا ہوا — اور ادھر اک تیر اُس صدا کی سمت مخفی میں چلا

گرچہ اٹکل سے چلایا میں نے تھا اس تیر کو — لیکن اس کی ابتدا سے آئی قضا نخچیر کو

آہ سینے سے کسی کے ایک نکلی درد ناک — جگر و دل اس کے ہو گئے جس سے چاک

(۳)

تھا یہاں کوئی رشی دنیا سے منہ موڑے ہوئے — اس نے دولت و تمنا کی بیڑیاں توڑے ہوئے

اس کا بیٹا تھا جسے پالا تھا اس نے ناز سے — جو ہوا گھائل مرے تیر غلط انداز سے

نیم بسمل ہو کے ندی میں یہ لڑکا گر پڑا — دکھ اور کرب کی حالت میں یوں کہنے لگا

ہائے زخموں سے کیا ہی مجھ کو کس نے چور چور — یہ سزا ہے جس کی ایسا کیا ہوا مجھ سے قصور

ہے مرا بیچارہ باپ اک راہب خلوت نشیں — جس نے اپنا آج کے دن تک کسی کو دکھ نہیں

پانی بھرنے کے لئے آیا تھا میں اس گھاٹ پر — بھر کے مٹکا جل سے اٹھا تھا کہ جلدی جاؤں گھر

کیا خبر تھی مجھ کو موت آ کر کھڑی ہے تاک میں — آنکھوں آنکھوں میں ملا جائے گی مجھ کو خاک میں

کچھ نہیں ہے رنج اپنی زندگانی کا مجھے
فکر ہے باپ اور ماں کی ناتوانی کا مجھے

ضعف کا یہ غلبہ ہے اُن سے ہلا جاتا نہیں
اُن کو آنکھوں سے نظر افسوس کچھ آتا نہیں

ہائے اُن کی چھوٹی آنکھوں کا ستارہ میں ہی تھا
اُن بیچاروں کے بڑھاپے کا سہارا میں ہی تھا

زندگی اُن کے لئے کیونکر نہ اب جنجال ہو
میرے بعد اُن کا خدا ہی جانے کیسا حال ہو

ایک مجھ کو ہی نہیں آکر لگا ہے تیر یہ
بلکہ اُن دونوں کا پہلو بھی گیا ہے چیر یہ

(۴)

جب سُنیں میں نے یہ باتیں جاں خراشِ دل فگار
ہوش میرے اڑ گئے سیماب سے جیسے فرار

میرے مذہب میں نہیں جائز کہ دوں لوگوں کو دُکھ
ہو یہ راجہ کے لئے لازم کہ دے پرجا کو سُکھ

بات یہ ممکن تھی پھر کیونکر کہ مجھ سے برملا
ہو کسی کی اور وہ بھی اک رشی کی ہتیا

بید لرزاں کی طرح ڈر سے لگا میں کانپنے
میں سمجھتا تھا مجھے گویا ڈسا ہے سانپ نے

ہاتھ سے میرے گرے تیر و کماں بے اختیار
جس طرح پتوں سے ہو خالی خزاں میں شاخسار

ڈگمگاتا لڑکھڑاتا میں گیا آخر وہاں
کر رہا تھا نالہ و شیون مرا بسمل جہاں

دیکھتا کیا ہوں کہ اک لڑکا نہایت ہی حسین
شانِ قدرت کی تماشا گاہ تھی جس کی جبیں

حُسن کا جس کے یہ عالم تھا کہ ماہِ آسماں
دیکھ لیتا گر اُسے غیرت سے ہو جاتا نہاں

سسکیاں لیتا ہوا زخمی پڑا ہے خاک پر
حسرت و اندوہ سے لبریز ہے اُس کی نظر

اُس کے شانوں پر جو تھی بھوری جٹا بکھری ہوئی
میں یہی سمجھا کہ یہ اکسیر ہے نکھری ہوئی

جس میں پانی تھا بھرا اُس نے وہ مٹی کا گھڑا ‏ ‏ اک طرف ٹوٹا ہُوا تھا پاس ہی اُس کے پڑا

(۵)

مَیں نے دیکھا اُس کو اور اُس نے نظر بھر کر مجھے ‏ ‏ روح کانپ اُٹھی مری کہنے لگا یوں جب اُسے

مَیں نے اے راجہ بتا تو کی تھی کیا تیری خطا ‏ ‏ ہائے تُو نے کس لئے سینہ مرا چھلنی کیا

کس لئے ڈھایا ہے اُس بیکس پہ یُوں تُو نے ستم ‏ ‏ اک رشی کے گھر میں ہو آ کر لیا جس نے جنم

باپ کے بیٹے کے اور ماں کے جگر تقدیر سے ‏ ‏ چھد گئے اک ساتھ اے راجہ ترے اک تیر سے

میری ماں اور باپ کو اس وقت میرا انتظار ‏ ‏ کر رہا ہوگا وہاں بے چین بے کل بے قرار

دیر سے پیاسے تھے وہ شدّت کی ہوگی اُن کو پیاس ‏ ‏ بندھ رہی دونوں کو ہوگی میرے گھر آنے کی آس

جلد جا پہنچا سُنا میری یہ میرے باپ کو ‏ ‏ اور بچا اُس کے غضب سے راجہ اپنے آپ کو

کیونکہ اے راجہ سراپ اُس نے اگر تجھ کو دیا ‏ ‏ یاد رکھ پل بھر میں تُو جل کر بھسم ہو جائیگا

لیکن اوّل میرے سینے سے جُدا یہ تیر کر ‏ ‏ درد سے مجھ کو بچانے کی کوئی تدبیر کر

تاکہ جان پُر الم نکلے ذرا آرام سے ‏ ‏ ورنہ ہوں میں غم رسا اس مرگ بے ہنگام سے

(۶)

اس قدر کہتے ہی لڑکے کی نظر پتھرا گئی ‏ ‏ اُس کے منہ پر مُردنی اور مجھ پہ حسرت چھا گئی

کھینچتے ہی تیر تن سے جان رُخصت ہو گئی ‏ ‏ رُوح اُس کی گود میں پرماتما کی سو گئی

مجھ سے نادانستہ سرزد ہو چکا تھا جو گناہ ‏ ‏ تھا خیال اُس کا وہ دریا جس کی ملتی تھی نہ تھاہ

دل میں درد و کرب کا چشمہ ابلتا تھا مرے
کوئی چٹکی سے کلیجے کو مسلتا تھا مرے

سرنگوں ہو کر کھڑا تھا میں سرہانے لاش کے
دل میں کہتا تھا مجھے یہ تیر لگتا کاش کے

سوچتا تھا میں مرا کفارۂ عصیاں ہو گیا
نذر ہے جس کی جگر اس درد کا درماں ہو گیا

جھونپڑے کے پاس پہنچا تو مجھے آیا نظر
باپ ماں لڑکے کے بیٹھے ہیں زمیں کے فرش پر

دونوں کے دونوں ہیں نابینا و پیرِ ناتواں
نور آنکھوں میں نہیں لیکن ہے چہروں پر عیاں

باغ میں گویا کہ ہیں دو طائرِ بے بال و پر
چھوڑ رکھا ہے جنہیں صیاد نے پر کاٹ کر

رہ گئے تھے اب تن تنہا یہ دونوں تیرہ بخت
آسماں تھا دور ان سے اور زمیں تھی ان پہ سخت

ہو کا عالم تھا یہاں کرتا تھا جنگل بھائیں بھائیں
سنسنی چھٹتی تھی سن سن کر ہوا کی سائیں سائیں

اس جگہ ان بیکسوں کا رہ نما کوئی نہ تھا
ناؤ تھی منجدھار میں اور ناخدا کوئی نہ تھا

ایک لنگر تھا سو مجھ سے وہ گیا تھا ٹوٹ بھی
ساتھ بیٹے کا بچاروں سے گیا تھا چھوٹ بھی

کر رہے تھے اپنے بیٹے کا وہ دونوں انتظار
آ رہا تھا یاد وہ اس وقت ان کو بار بار

(۷)

دے دیا دھوکا انہیں میرے قدم کی چاپ نے
کی ملامت اس طرح لختِ جگر کو باپ نے

جانِ بابا! تو نے دیر اتنی لگا دی کس لئے
پیاس جلد آ کر نہیں میری بجھائی کس لئے

کھیل میں تو نے گنوایا وقت گھر کے کام کا ○ کچھ خیال آیا نہ ماں اور باپ کے آرام کا

جلد جلد اٹھتے نہیں کس واسطے تیرے قدم
بھاگ کر آ اپنی چھاتی سے لگا لیں تجھ کو ہم

باپ یاں کی آنکھ کے تارے تڑپتی کھیا رہی ماں ۔۔۔ دیر سے چنتا میں گھڑیاں گنتی بیٹھی ہے یہاں

دی ہے بڈھے باپ نے جھڑکی اگر بیٹا تجھے ۔۔۔ مت خفا ہو بلکہ میری جاں بھلا دل سے اسے

یاد رکھ تجھ کو سکھاتا ہے دھرم تیرا یہی ۔۔۔ اُس سے نیکی کر ہمیشہ جو کرے تجھ سے بدی

کس لئے چپ چاپ ہے اے میرے پیارے کچھ تو بول ۔۔۔ اس قدر کیوں ہو گیا دلگیر گھنڈی دل کی کھول

(۸)

اُس کی ان باتوں نے ڈالے زخم دل میں جان میں ۔۔۔ اور اُنڈیلا سیسہ گرم کرکے میرے کان میں

گڑ گیا تھا میں زمیں میں بند تھی میری زباں ۔۔۔ وہ اُدھر رطب اللساں اور میں اِدھر آتش بجاں

لا سکا جب اپنی خاموشی کی خود میں بھی نہ تاب ۔۔۔ جی کڑا کر کے دیا آخر اُسے میں نے جواب

میں نہیں ہوں اے بھگت بھگوان کے بیٹا ترا ۔۔۔ راجہ ہوں کم بخت جو تھا میں اس اُجڑے دیس کا

آج میں کرنے شکار آیا تھا سانبھر کا اِدھر ۔۔۔ ایک ندی پر ہوا تقدیر سے میرا گزر

پانی بھرتا تھا وہاں فرزند تیرا ہائے ہائے ۔۔۔ جا لگا بھولے سے اُس کو تیر میرا ہائے ہائے

اے رشی اس سے زیادہ اور تجھ سے کیا کہوں ۔۔۔ تیری کرپا اور دیا کا اب فقط محتاج ہوں

(۹)

مختصر تھی گرچہ میری داستانِ پُر الم ۔۔۔ برق خرمن سوز کے گرنے سے لیکن تھی نہ کم

جب رشی میری زبانی سن چکا یہ ماجرا ۔۔۔ آ گیا غش اُس کو اور دھم سے زمیں پر گر پڑا

دیر تک القصہ طاری اُس پہ بے ہوشی رہی ۔۔۔ نکتہ چیں دردِ جگر پر خود فراموشی رہی

آہ آخر اک بھری اُس نے کہ چل اُٹھا جگر　　　یاد رکھوں گا میں اس آہِ از غم کو عمر بھر
اس طرح مجھ سے کہا اُس تیرہ قسمت نے خطاب　　　یاس اور حسرت میں تھا ڈوبا ہُوا اُس کا جواب
خود بخود چل کر نہ میرے پاس تُو آتا اگر　　　[illegible] نہ دیتا اس مصیبت کی مجھے آکر خبر
میرے نورِ چشم کا یہ خونِ ناحق بے گماں　　　[illegible] دُنیا سے مٹا دیتا ترا نام و نشاں
مجھ کو تیرے جرم کی نسبت ہُوا پُورا یقیں　　　دیدہ و دانستہ یہ سرزد ہُوا تجھ سے نہیں
تُو ہے مُبتلا لغزشوں کا آخر اک انسان ہے　　　گرچہ تُو اس وقت پاپی ہے مگر انجان ہے
ورنہ اے راجہ کسی کارن نہ تو بچتا کبھی　　　راجدھانی تیری لُٹتی نسل بھی مٹتی سبھی
لے چل اب ہم بدنصیبوں کو وہاں تُو جلد تر　　　جس جگہ وہ چاند کا ٹکڑا ہے سوتا بے خبر
تاکہ ہم دل کا نکالیں آخری ارمان بھی　　　اپنے بچّے پر نچھاور جی کریں اور جان بھی

(۱۰)

مار کر دھاڑیں غرض سر پیٹتے روتے ہوئے　　　اپنے دل کو تھامتے اور جان کو کھوتے ہوئے
میرے پیچھے پیچھے لاٹھی ٹیکتے پہنچے وہاں　　　سو رہا تھا خاک میں لختِ جگر اُن کا جہاں
لاش پر دونوں گرے یُوں باپ نے نوحہ کیا　　　جس کو سُن سُن کر زمیں کانپی فلک تھرّا گیا

رشی کا نوحہ

کس لئے اُٹھ کر نہیں کرتے ہمیں بیٹا سلام　　　خاک میں عزّت ملاتے ہو ہماری ہائے ہائے
چاند سے مُکھڑے پہ ڈالا ہے نقابِ خاک و خوں　　　شکل پہچانی نہیں جاتی تمہاری ہائے ہائے

اپنے روٹھے کو منانے چل کے خود آئی ہے ماں ۔۔۔ کہہ رہی ہے ماں چاہیں تجھ پہ واری ہائے ہائے

تیرے سینے میں جو مارا تاک کر راجہ نے تیر ۔۔۔ کیوں نہ ہم پر بھی چلا دی اک کٹاری ہائے ہائے

بھولنا چاہیں گے ہم لیکن نہ بھولیں گے تری ۔۔۔ شکل بھولی بھولی باتیں پیاری پیاری ہائے ہائے

میں نے یہ کس دن کہا تھا خاک ہی بن جا کے مل ○ اتنی بھی اچھی نہیں ہے خاکساری ہائے ہائے

تم سدھارے سُرگ کو اور ہم کو چھوڑا نرگ میں ۔۔۔ چاہ کی وہ ریت کیوں تم نے بساری ہائے ہائے

تیری اندھی اور دُکھیا ماں کی میں تیری طرح ۔۔۔ کر سکوں گا کس طرح خدمتگزاری ہائے ہائے

ایک بیٹا تھا لیا قسمت نے وہ بھی ہم سے چھین ۔۔۔ ہو گئی ہے زندگانی ہم پہ بھاری ہائے ہائے

جا چکا سامان اپنا دیر کا بیکنٹھ کو ۔۔۔ رُک نہیں سکتی ہے اب رخصت ہماری ہائے ہائے

——— (۱۱) ———

بین یہ کر کر کے مجھ پر ڈھا رہے تھے جو ستم ۔۔۔ آخر اُس نے اپنے بیٹے کا کیا کریا کرم

لے خود اور رہبر بن کر میں کھڑا تھا پاس ہی ۔۔۔ یک بیک مجھ پر پلٹ کر یوں لگا کہنے رشی

ایک ہی تھا یہ میرا لختِ جگر نورِ نظر ۔۔۔ تُو نے اُس کی جان لی تجھ پہ ہے خوں اس کا ہدر

مجھ پہ بھی اک وار کر دُو نا ترا احسان ہو ۔۔۔ بندشِ غم سے کہیں آزاد مری جان ہو

یاد رکھ لیکن مرا کہنا، بہ ایں جاہ و حشم

تیری قسمت میں بھی ہے لکھا ہُوا بیٹے کا غم

(۱۳)

تاجدارِ دکن

سے

مسز سروجنی نائیڈو کی عقیدت

میرے زمانۂ قیام حیدرآباد دکن میں جب موجودہ تاجدارِ دکن کے والد خلد آشیاں میر محبوب علی خاں سریر آرائے سلطنت ہوئے عہد سعید کی تقریب پر مسز سروجنی نائیڈو نے ایک نظم جسے بارگاہ سلطانی میں پیش کرنا مقصود تھا بزبان انگریزی لکھی تھی اور مجھ سے اس نظم کے اردو ترجمہ کی فرمائش کی تھی۔ یہ ترجمہ اربابِ ذوق کی نذر ہے۔

(۱)

اے خسرو ذی شوکت و ذی حشمت و ذی فر
دُرہائے سخن سے ہے مکلل ترا افسر

رہتے ہیں بہم مختلف اقوام و مذاہب
باعافیت و امن ترے عہد میں مل کر

لائی ہوں ترے واسطے اخلاص سے شاہا
میں تہنیتِ عید کا گلدستہ بنا کر

یہ ہدیۂ ناچیز پسند آئے جو شہ کو
پایہ ہو ثریّا سے مری نظم کا برتر

(۲)

سب اپنی رعایا پہ نظر ہی تری یکساں　　ہے ایک تجھے ہو وہ برہمن کہ مسلماں
تُو اُمّتِ احمد کا ہے سرتاج، تو آقا　　اُن کا ہی جو رکھتے ہیں جبیں قشقہ سے تاباں
سُورج کے پُجاری ہیں تری آنکھ کا تارا　　جو چھوڑ کے آئے تھے یہاں ساحلِ ایراں
تُو اُن کا خداوند ہی جو اُس کے ہیں بندے
جو بحر کی موجوں پہ ہوا رات کو پویاں

(۳)

جب دیکھتے ہیں ہم ترے دربار کی شوکت　　یاد آتی ہے بغداد کی گزری ہوئی عظمت
اک جشن میں تیرے نظر آئے وہ چراغاں　　ہیں جن سے الف لیلہ کے افسانوں کی زینت
دیتی ہے دُعا ساقیِ مستانہ ادا کو　　ہر صبح و مسا پیتی ہی جب شوق سے خلقت
وہ جام چھلکتا ہوا تیری غزلوں کا
آتی ہے نظر جس میں تصوّف کی حقیقت

(۴)

پُر رونق و آباد ترے شہر ہیں صدہا　　جنگل میں ہے منگل کا دل آویز تماشا
جو مُلک ترے زیرِ نگیں آج ہے اُس میں　　آثار پدید است صنادیدِ عجم را
معمور خزانے ہیں ترے اور ترے خرمن　　اور اُن کے محافظ ترے خدام ہیں شاہا

(۵)

شامل ترے شاہا کرم و فضلِ خدا ہو　　تو حامیٔ حق ماحیٔ آئینِ جفا ہو
عفت کی شجاعت کی فضیلت کی کرے قدر　　تو ناصرِ کیشِ شہِ لولاک لما ہو
فردوسیٔ طوسی بھی تھا جن اوصاف کا وصاف　　درجہ ترے اوصاف کا اُن سے بھی سوا ہو
اشعار ترے درج ہوں ضرب المثلوں میں
اور اسم مبارک ترا اک رکنِ دُعا ہو

(۱۴)

ایک بیرسٹر کی آپ بیتی

لٹائی خوب ہی باوا کی دولت ہم نے لندن میں ○ گیا تھا چھوٹ تنہا باغباں گلچیں کو گلشن میں

خریدارِ متاعِ جلوہ تھا یاں حسنِ بے پردہ ○ بھرے تھے پھول رنگا رنگ بیباکی کے دامن میں

نہ تھی پنہاں نقابوں میں یہاں عارض کی رنگینی ○ نہ تھے نازو ادا مخفی یہاں چہرہ کی چلمن میں

نظر آیا یہاں پریوں کا ایسا جمگھٹا ہم کو ○ لگا دی آگ جس نے صبر و دانش کے خرمن میں

کبھی گرجا میں جا کر ہم نے گھورا ماہ رویوں کو ○ کبھی تاک آئے ہم جا کر کسی گلرو کو گلشن میں

کبھی گلیوں میں آ دھمکے ان کو یہ مرغِ دل اپنا ○ نظر آیا کسی گیسوئے زریں کے نشیمن میں

کبھی پہنچے تھیٹر میں تو چھنو آئے دل ان سے ○ ہے جادو جن کی باتوں میں ہے شوخی جن کی چتون میں

بوقتِ رقص یوں ہم بال میں لپٹے کسی مس سے ○ کہ مقناطیس گویا ہو گیا پیوستہ آہن میں

کبھی پکنک کے جلسہ میں ہوئے شامل تو دن بھر ○ حمائل ہاتھ تھے سیمین کی بوتل کی گردن میں

کبھی ریجھے ہم اپنی لینڈ لیڈی ہی کی بیٹی پر ○ کبھی شانِ خدا دیکھی کسی ہوٹل کی ساقن میں

مٹن چاپ اور کٹلٹ کھا کے ہم ہنستے تھے خوب ان پر ○ مگن رہتے ہیں جو روٹی میں اور بے گھی کے سالن میں

پہن کر کوٹ اور پتلون ہوتی تھی ہمیں حیرت ○ بسر ہوتی ہے کیونکر پائجامہ اور اچکن میں

پھرتے ایسٹ اینڈ و ویسٹ اینڈ میں جب جا نکلتے تھے ○ تو خم آنے نہ دیتا تھا کلف کالر کا گردن میں

ہماری ٹائی پن کے آگے سورج کی کرن یوں تھی ○ پڑا میلا سا اک تاگا ہو گویا چشم سوزن میں

خط آتا تھا جو بابا کا کہ کچھ پڑھتے بھی ہو بیٹا ○ تو لکھ دیتے تھے ہم محنت سے خون بھی جلتا ہے تن میں

نہیں شک اس میں گو سیکھے ہزاروں ہم نے فیشن کے ○ نہ سیکھا ایک نکتہ بھی مگر قانون کے فن میں

کتابیں بن گئیں گلدستۂ طاق فراموشی ○ ہوئے رہ رہ کے بیسوں فیل ہم اگزامینیشن میں

ولایت میں غرض ایسے اڑائے ہم نے گلچھرے ○ کہ لی جمشید نے حسرت سے کروٹ اپنے مدفن میں

مگر کب تک یہ گلچھرے جو ہوتا گنج قاروں بھی ○ تو ایندھن کے لئے کافی نہ ہوتا ایسے گلخن میں!

جب اٹھے صبح کو اک دن تو تھی بے مایہ ہمیانی ○ ہوئی خالی بھری تھی جس قدر اسٹیم انجن میں

شراب و مطرب و ساقی چھٹے بدبخت ہم سب سے ○ سکھائی بے زری نے فاقہ مستی ہم کو لندن میں

ہوئے جب ہم نشیں پرسان حال ان سے کہا ہم نے ○ میں دامن ہی نہیں رکھتا جو الجھے خار دامن میں

---

(۱۵)

لسان الغیب

کے چند اشعار کی تضمین

منہ میں فقط زبان ہے اور ہاتھ میں قلم — وہ غم کی ترجمان ہے یہ کاشفِ الم
دہرائے جاؤں گا یہ حدیثِ غم و الم — من ترک عشقبازی و ساغر نمی کنم
صد بار توبہ کردم و دیگر نمی کنم

آبِ بقا جناب کا میرے لئے ہے سم — ہے نوشدارو آپ سمجھتے ہیں جس کو بم
کیجے جناب قبلہ مرے حال پر کرم — من ترک عشقبازی و ساغر نمی کنم
صد بار توبہ کردم و دیگر نمی کنم

کچھ بھی نہیں ہے لابہ گری کا مجھے شعور — بنتا نہیں کبھی مجھے آیا سگِ حضور
ہوں قوم سے قریب جو سرکار سے ہوں دُور — باغِ بہشت و سایۂ طوبیٰ و قصرِ حُور
با خاکِ کوئے دوست برابر نمی کنم

چلائیں کتنی بار کہ ہم ہیں خدا پرست — جامِ مئے الست کے ہم سب کے سب ہیں مست
اسلامیوں کے عہدِ وفا کو نہیں شکست — تلقین و درس اہلِ نظر یک اشارت است
گفتم کنایتے و مکرر نمی کنم

(۱۶)

شاعرانہ گفت و شنید

۲۶ جنوری ۱۹۱۲ء کے "زمیندار" میں حضرت شفق عماد پوری کی نظم ذیل شائع ہوئی:-

اِک دن یہ مجھ سے کہنے لگے ایک مہرباں
کیا آپ نکتہ سنج نہیں نکتہ داں نہیں

کیا آشنا مذاقِ سخن سے نہیں ہیں آپ
کیا آپ ذوقِ نظم سے رطب اللساں نہیں

صہبائے میر و بادۂ گلرنگِ درد سے
دو گھونٹ بھی نصیبِ مئے ارغواں نہیں

چلتا نہیں ہے بزم میں کیا دورِ مصحفی
کیا اب وہ سلسلہ نہیں یا خانداں نہیں

اگلے سخنوروں کا نہیں مثل تو نہ ہو
کیا نام کو بھی شعر کا باقی نشاں نہیں

کوئی تو ہوگا طوطیٔ خوش لہجۂ چمن
مانا کہ داغ بلبلِ ہندوستاں نہیں

زندہ کریں امیر خدائے سخن کا نام
ایسے خدا کے بندوں سے خالی جہاں نہیں

کی میں نے التماس مقامِ نیاز سے — بندہ نواز ناز کا موقع یہاں نہیں
کہتے ہیں شعر کس کو سخن کس کا نام ہے — یہ امتیاز بھی مجھے اے مہرباں نہیں
جوہر شناس جس کو جواہر سے تول لیں — اب گوہرِ سخن کا وہ پلہ گراں نہیں
ہیں وہ خم و قدح نہ وہ پیمانہ و سبو — وہ پیرِ مے فروش کی اونچی دکاں نہیں
اس پر یہ لطف ہے کہ سخنور ہیں سینکڑوں — ایسا بھی کوئی شہر ہے شاعر جہاں نہیں
پورب کے باکمالوں کی مٹی خراب ہے — دامن پہ ہے یہ داغ کہ اہلِ زباں نہیں
پچھم کے کچھ ہیں اہلِ زباں مستند مگر — سب قادر الکلام نہیں خوش بیاں نہیں
جو نکتہ داں ہیں واقفِ فن ماہرِ زباں — کچھ اُن کے اتباعِ سخن میں زیاں نہیں

کالج کی ڈگریوں کی شفیق کو ہو کیا اُمید
جب اُس کی جیب میں سندِ امتحاں نہیں

حضرت شفیق کے اس ارشاد پر میری طرف سے اشعار ذیل میں تبصرہ ہوا :۔

جو کچھ کہا جنابِ شفیق نے، خدا گواہ — اُس میں ہمیں مجالِ چنین و چناں نہیں
ہم کو سلیقہ گرچہ نہیں انتقاد کا — ہم گرچہ نکتہ رس نہیں اور نکتہ داں نہیں
لیکن اگر کسی کو ہو یہ ادعا کہ آج — ہندوستاں میں ایک بھی شیوہ بیاں نہیں
ہم کو نہیں ہے اُس کے عقیدے سے اتفاق — ہم اُس کی ایسی ہاں میں ملا سکتے ہاں نہیں
اقبال ہی کو لیجیے گر چاہیے مثال — جو نکتہ چیں کے زعم میں اہلِ زباں نہیں

وہ کون سی زمین ہے دُنیائے فکر میں — اُس نے بنا دیا جسے آج آسماں نہیں
ملّت کے دل کے واسطے سرمایۂ گداز — کیا اُس کی دردناک نوا ریزیاں نہیں
کیا اُس کی داستان کی جدّت طرازیاں — صرفِ بقائے سلسلۂ پاستاں نہیں
اُس کے کلام میں نہیں کیا سوزِ میرؔ و دردؔ — یا غالبؔ و امیرؔ کی رنگینیاں نہیں

دہلی و لکھنؤ پہ نہیں حصرِ شاعری
وہ خطّہ کونسا ہے یہ دولت جہاں نہیں



(۱۷)

خواجہ حالی

کی ایک غزل کے چند اشعار کی تضمین

رنگ میں یہ ڈالتے رہتے ہیں بھنگ　　ہیں قیامت کے حریفانِ فرنگ
چڑھ نہیں سکتا ہے تلواروں پہ زنگ　　صُلح ہے اک مُہلتِ سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

توپ کیا بندوق کیا تلوار کیا　　کوٹ کیا پتلون کیا اخبار کیا
پوپ کیا اور شاہ کیا اورزار کیا　　علم کیا اخلاق کیا ہتھیار کیا
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ

جسم میں ہر روز اتراتی ہے رُوح　　قوم کا غم رات دن کھاتی ہے رُوح
کون کہتا ہے گھٹی جاتی ہے رُوح　　کاہشوں سے پرورش پاتی ہے رُوح
اب لگا کھایا ہے سب آکے انگ

ختم وُہ اگلا فسانہ ہو چُکا　　کھکھ ہوُئے خالی خزانہ ہو چُکا
بے ٹھکانوں کا ٹھکانہ ہو چُکا　　کام کا شاید زمانہ ہو چُکا
دل میں اب اُٹھتی نہیں کوئی اُمنگ

ڈالتا ہے دل میں وسواس اتفاق　　خوب ہے پھٹکے نہ گر پاس اتفاق
کر ہی دے گا ستیاناس اتفاق　　قوم کو حالی نہیں راس اتفاق!
پھُوٹ ہی کا بس کھُلے گا ہم پہ رنگ

(۱۸)

لندنی معشوقہ اور دہلوی عاشق

اِک سُنہرے بالوں والی میم نے ہنس کر کہا
اپنے اک ہندوستانی عاشقِ مفتون سے

مَیں نے یہ مانا کہ تم کھاتے ہو چھُری کانٹے سے
شوق رکھتے ہو قمیص و کالر و پتلون سے

بنگلہ میں رہتے ہو اور چڑھتے ہو موٹر کار پر
بیٹھتے ہو باٹ پر دھوتے ہو مُنہ صابون سے

توڑتے ہو ٹانگ انگریزی کی اُٹھتے بیٹھتے
بات جب کرتے ہو تم کرتے ہو ٹیلیفون سے

کرتے ہو ہر موسمِ گرما میں لندن کا طواف
پاؤں آ جاتا ہے چکر میں تمہارا جُون سے

لیکن آخر تم وہی کالے مچھندر ہی تو ہو
رنگِ یورپ اُڑ گیا جس کی رگوں کے خون سے

یہ تمہاری جیب تھی جس پر مرا دل آ گیا
ورنہ مَیں اور اختلاط ایسے سگِ مختون سے!

(۱۹)

ہندوستان کے اسلامی جذبات

۱۹۱۲ء میں

جوش میں پھر رحمتِ پروردگار آنے کو ہے
جس کے صدقہ میں نویدِ وصلِ یار آنے کو ہے

قدسیوں میں ہو رہی تھیں آج یہ سرگوشیاں
عنقریب اسلام کی فصلِ بہار آنے کو ہے

یار کے چہرے سے اُٹھے گا کوئی دم میں نقاب
ہو گئیں جس کی نگاہیں دل کے پار آنے کو ہے

آمد آمد حسن کے انور کی کس نا وانے کہا
کانپتے ہیں جس سے ہم وہ شہسوار آنے کو ہے

جمع ہونے کو صفِ انصار میں ستو سی جوش
لشکرِ بر بر قطار اندر قطار آنے کو ہے

اُڑ گئے درنا و بنغازی میں روما کے دھوئیں
حضرتِ پاپا کو شدت کا بخار آنے کو ہے

قیمت انکواتے تھے کل تک جس کی مسلم چار لاکھ
بک رہی وہ جنس بازاروں میں چار آنے کو ہے

تازہ پھر ہونے کو ہے دار و رسن کی داستاں
پھر انا الحق کی صدا مستانہ وار آنے کو ہے

بیکسوں کی آہ سے جو اُٹھ رہی ہے پے بہ پے — گنبدِ گردوں گرد اس پر غبار آنے کو ہے

جتنے خوں بہنے لگی ہے رشت اور تبریز میں — سینٹ پٹرسبرگ سے طہران میں زار آنے کو ہے

جارج خامس جب چلے لندن سے ہم سب نے کہا — امن اور انصاف کا آئینہ دار آنے کو ہے

کیوں نہ چمکے آفتابِ دولت و اقبالِ ہند — چل کراس میں جب ہمارا شہریار آنے کو ہے

ابرِ نیساں بن کے برسے گا شہنشہ کا کرم — تھا ہمیں مدت سے جس کا انتظار آنے کو ہے

آئے بھی چل بھی دئے دہلی سے لندن کو حضور — تجھ کو دولت اپنے مرکز پر قرار آنے کو ہے

زار[1] قیصر[2] جوزف[3] اور وکٹر[4] سے کیوں ملتے ہیں جارج[5]

چار بدمستوں میں کیوں اک ہوشیار آنے کو ہے

~~~~~~~~~~

[1] زار روس — [2] قیصر جرمنی — [3] شہنشاہ آسٹریا

[4] بادشاہ اٹلی — [5] شاہ انگلستان
~~~~~~~~~~

(۲۰)

چند علمی اور عمرانی نکتے

قوم کی بندھنے کو ہے ٹوٹی ہوئی آس ایک دن
ہم میں ہونے کو ہیں پیدا خضر و الیاس ایک دن

ہو چلا ہے مُلک کو اپنی ترقی کا خیال
بامِ عزت پر چڑھا دے گا یہ احساس ایک دن

تشنہ کامانِ وطن کرتے ہیں شور العطش
علم کے پانی سے بجھ جائے گی یہ پیاس ایک دن

دولتِ حکمت سے مالا مال ہو جائے گا مُلک
اپنے گھر کی راہ لے گا جہل و افلاس ایک دن

لازمی تعلیم کا قانون ٹل سکتا نہیں
کونسل اس بل کو کرے گی بے گماں پاس ایک دن

پیٹ میں خود پروری کا جن کے اُٹھتا ہے مروڑ
اُن کو خودداری کا دے گا ہند املتاس ایک دن

خود فروشی سے ہے کھل جانے کو خودداری کا فرق
فربہی سے قطع ہو جائے گا آماس ایک دن

ہرچرن داس ایک دن ہونے کو ہے عبدالفہی
اس ہرن کی پیٹھ پر لد جائے گی گھاس ایک دن

تیرے ظلِ عاطفت میں دولتِ ہندوستاں
ایک ہو جانے کو ہیں لاہور و مدراس ایک دن

دیکھنا شیر و شکر ہو جائیں گے اہلِ وطن
رہ چکے ہیں دُور دُور آنے کو ہیں پاس ایک دن

حُبِّ قومی کے کھلیں گے ہند کے گلشن میں پھول
پھیل جائے گی جہاں میں ان کی بو باس ایک دن

چل رہی ہے جو ہوائے اتحادِ باہمی
ہندو و مسلم کو وہ آ جائے گی راس ایک دن

یہ ہیں دامن اور وہ چولی، یہ ہیں ناخن اور وہ گوشت
مظہر الحق سے ملیں گے سرگرو داس ایک دن

اور اگر پھر بھی رہے دست و گریباں یہ بزرگ
مُلک کا ہو کر رہے گا ستیاناس ایک دن

(۲۱)

دعوت کا ایک رقعہ

اور

اُس کا جواب

شیخ امام الدین صاحب چیف کلرک دفتر لوکو سپرنٹنڈنٹ نارتھ ویسٹرن ریلوے لاہور نے اپنے صاحبزادہ کی عروسی کی تقریب پر مجھے ایک منظوم دعوتی رقعہ بھیجتے ہوئے لکھا کہ :-

شادی قرار پائی ہے عبداللطیف کی
آکر غریب خانہ کی عزت بڑھایئے

ہے پانچویں مئی کو ضیافت ولیمہ کی
کھانا غریب خانہ پہ اُس روز کھایئے

میں نے انہیں حسب ذیل جواب دیا :-

اے شیخ جی یہ جشن مبارک ہو آپ کو
ہاں خوب دھوم دھام سے شادی منایئے

احباب کو بلایئے دعوت میں شوق سے
بسکٹ کھلایئے انہیں سوڈا پلایئے

اللہ نے دیا ہے زر و مال آپ کو
لِلّٰہ کارِ خیر میں بھی کچھ اٹھایئے

درماندہ قوم کا رہے اس وقت کچھ خیال
بحرِ سخا کو جوشش و تموّج میں لائیے

ارضِ طرابلس میں ہیں مسلم شکستہ حال
اُن کی مدد کے واسطے توڑے دلائیے

پڑھ لیجئے گا نوٹ کراچی کے سیٹھ پہ
ایسی ہی آپ بھی تو سخاوت دکھائیے

آئے گا کام حشر کے دن سب لیا دیا
دُنیا میں دیجئے تو قیامت میں پائیے

اک کے عوض ملیں گے وہاں دس ضرور ہی
آسان یہ طریق ہے دولت بڑھائیے



(۲۲)

یورپ کا بین الاقوامی قانون

یورپ والو تم تو سمجھتے ہی نہیں ہو انسان ہمیں
اور جو سمجھتے بھی ہو تو شاید جانتے ہو نادان ہمیں
عدل تمہارا ہے زیرِ مغرب جو ہے طمع مشرق کو
کہہ نہ سکیں گو کچھ بھی زباں سے لیکن ہو گئے کان ہمیں
طبلِ نمود بجا کر نازاں اپنے نام پہ آپ ہوئے
آپ کو لمن الملک مبارک اور علیہا فان ہمیں
آپ ہیں گورے ہم ہیں کالے آپ کو شاید ہے یہ خیال
چونکہ ہے کالی اس لئے پیاری ہو نہیں سکتی جان ہمیں

آپ کو ہم سے عار ہو لیکن ایک ہیں ہم اس فرق کے ساتھ
آپ کو اپنی جان ہے پیاری اور ہے عزیز ایمان ہمیں

ایک طرف یہ صدمۂ مطلق تم نے مرا قش چھین لیا
ایک طرف یہ خوف معلّق وا غ نہ دے ایران ہمیں

قدسیوں نے کل نور کی یہ گت چھیڑی چنگ بصیرت پر
وجد میں رہ رہ کر لے آئی جس کی رسیلی تان ہمیں

ہم کو ہمارے حال پہ چھوڑے آئے ہم اس تہذیب سے باز
کچھ نہیں یورپ سے ہمیں مطلب چاہئے انگلستان[1] ہمیں



[1] یہ ۱۹۱۲ء کا قافیہ ہے۔ اب ۱۹۴۷ء ہے۔ اس لئے قافیہ بدل گیا۔ اور "پاکستان" ہو گیا۔

(۲۳)

حجّتِ منتظر کا انتظار

کسی نے تو ہتھیا لیا ہے حرا کو　　کوئی تاکتا ہے پڑا پرشیا کو

جہاں میں حکومت ہے طاغوتیوں کی　　بُھلایا ہے بندوں نے اپنے خدا کو

نہ اپنے نہ اسلام کے کام آئی　　یہ شکوہ ہے جانِ حزیں سے قضا کو

گرے گی کوئی دم میں غیرت کی بجلی ○ وہ ٹھکرا رہے ہیں مری التجا کو

مسیحا سے جس کا لکھاتا ہوں نسخہ　　نہیں درد پر کوئی حق اُس دوا کو

مرا چارہ گر ہے پیمبر عرب کا　　وہ سرکار کافی ہے میری شفا کو

گداز اور رقت سے خالی ہوا دل　　اثر رو رہا ہے ہماری دُعا کو

عبث ناز کرتے ہیں ہم ابتدا پر ○ ہمیں دیکھنا چاہئے انتہا کو

عمل گر یہی ہیں تو ہم حشر کے دن　　دکھائیں گے منہ جا کے کیا مصطفٰےؐ کو

وہ نورِ حقیقت رسولِ خدا نے　　منوّر کیا جس سے غارِ حرا کو

چمکتا ہوا سارے مشرق میں پھیلا　　کیا روشن اُس نے تمام ایشیا کو

پھر اُس نے کیا مغربی کشوروں میں　　جُدا النقش و اللیل سے والضحیٰ کو

ضلالت کی شبہائے فاسق کی ظلمت
نہیں میٹ سکتی ہے اس انجلا کو

(۲)

ہے مسلم کے سینہ میں یہ نور پنہاں — شرر راکھ میں جس طرح چھپ رہا ہو
اگر راکھ ہٹ جائے پھر یہ شرارہ — زمانہ کی مشعل کو آتش نما ہو
مگر شرطِ مشعل فروزی یہی ہے — کوئی حجتِ منتظر رو کشا ہو
کیا ہم سے جو وعدہ قراں میں تو نے — بہت جلد [illegible] وعدہ یا رب وفا ہو
کر انصاف تو ہی کہ کیا یہ روا ہے — ذلیل اس طرح امتِ مصطفےٰ ہو
معلق ہو گو وہ غم اسلامیوں پر — مصیبت میں چھوٹا بڑا مبتلا ہو
برس جائے پھر تیری رحمت کا بادل — پھر اسلام کا باغ یا رب ہرا ہو

ہو اس وقت کا منتظر گوش ملت
کہ نقارہ اسلام کا بج رہا ہو

لاہور ۔ ۱۴ مئی ۱۹۱۲ء

(۲۴)

سمندر کی روانی اور تخیل کی جولانی

دسمبر ۱۹۱۲ئہ کے اواخر میں سیاسی ضرورتوں سے مجبور ہو کر مجھے سیاحتِ یورپ کا اتفاق ہوا۔ اس سے پہلے میں نے سمندر کا سفر کبھی نہ کیا تھا۔ بحرِ ہند۔ بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم سے ہوتا ہوا میں مارسیل پہنچا جو جنوبی فرانس کا بندرگاہ ہے۔ اور وہاں سے براہ پیرس رودبارِ انگلستان کو عبور کرکے لندن پہنچا۔ ان سمندروں کی زنگار رنگ موجوں نے میرے قلب پر جو اثر ڈالا اور دریائی مناظر نے دل اور دماغ میں جو گوناگون کیفیات پیدا کیں۔ ان سب نے مل کر ایک نظم کی شکل اختیار کرلی۔ جسے میں نے پیرس کے دو روزہ قیام میں سپردِ قلم کیا۔ وہ نظم یہ ہے:-

اے محیطِ بیکراں اے بحرِ ناپیدا کنار ۔۔۔ تیری یکتائی ہے نقشِ وحدتِ پروردگا

تیرے عارض پر جمال اُس کا فروغ افشاں کبھی ۔۔۔ اور جلال اُس کا کبھی تیری جبیں پر جلوہ با

ہیں تری پہنائیاں سنجابِ دامانِ خیال ۔۔۔ اور تری جولانیاں آغوشِ فطرت کا فشا

تیرا اک چینِ ابرو آفتِ جانِ حزیں ۔۔۔ تیرا اک اک خندۂ لب لطفِ عمرِ مستعا

تو کہیں ابیض کہیں اسود کہیں احمر ہوا ۔۔۔ جلوۂ نیرنگ قدرت ہے ترا نقش و نگا

حُسن تیرا لازوال اور عمر تیری جاوداں
ہو نہیں سکتی خزاں سے منفعل تیری بہار

آخری ہچکی علیہا فان کی تُو ہو تو ہو
اے ہم آغوشِ ازل اور اے ابد سے ہمکنار

نیلی نیلی تیری موجیں ہیں پرا باندھے ہوئے
یا ملکِ قدرت کی فوجیں ہیں قطار اندر قطار

جب بہار آتی ہے کرتا تُو بھی ہے میری طرح
جامہ اپنا چاک چاک اور دامن اپنا تار تار

ہیں عنادل سے بھی شیریں تر ترے نالے کبھی
اور گرجتا ہے کبھی تُو بے محابا رعد وار

پھیل جاتا ہے کبھی تُو اور سمٹ جاتا بھی ہے
ہے بلندی میں ابھی کوہ اور ابھی پستی میں غار

تمکنت میں کر دیا لیلیٰ کو تُو نے آب آب
اور جنوں میں قیس کا تُو نے گھٹایا اعتبار

تُو سکوں میں ہے نشانِ راحت و لطفِ خدا
تُو ہے طوفاں میں دلیلِ قہر و خشمِ کردگار

میں نے ساغر گیر تیرا چاند کو پایا کبھی
اور کبھی خورشید کو دیکھا ترا آئینہ دار

میں نے ذوالقرنین کی مانند دیکھا ہے تجھے
جب ترے گرمابہ میں اُترا ہے مہرِ تابدار

عارض و قامت سے تھی عہدِ وفا توڑے ہوئے
اُس کی نارنجی نقاب اُس کی قبائے زرنگار

تار و پودِ شوق تھا اُوپر تلے بکھرا ہوا
اُس کی کرنیں مضطرب تھیں تیری لہریں بے قرار

میری عشرت گاہِ بینش میں ہوا ہے عشوہ سنج
دستِ شوخِ ماہتاب اُٹھے تیرے سینے کا اُبھار

تُو مجھے دُنبالۂ کشتی سے آیا ہے نظر
چشمِ روشن میں لگائے سرمۂ دُنبالہ دار

میں نے دیکھا ہے ترا ہیبت فزا جوش و خروش
ہو چکی تھی ظلمتِ شب جب محیطِ روزگار

بجھ چکی تھی آسماں پر مشعلِ ماہِ منیر
منقلِ گردوں میں چمکاتے نہ تھے انجم کے شرار

میں نے دیکھا ہے تجھے خاکِ عرب کو چومتے — اے فدا تیرے اس آئینِ پیمبری جانیں ہزار
سجدہ کرتا رہ اسے جب تک ہے تجھ میں جزر و مد — اے ترا نورِ نگہ اس خاکِ اطہر کا غبار
عرش پر گر فرش بھاری ہے تو ہے اس خاک سے — جس میں محوِ خواب ہے کون و مکاں کا تاجدار
وہ کہ جس کا نام ہے نقدِ دو گیتی کی کلید — وہ کہ جس کی ذات ہے حسنِ دو عالم کا نکھار
وہ کہ جس کی سیزدہ صد سالہ حکمت پر ہوئے — مشرق و مغرب کے اشراقی و مشائی نثار
وہ کہ جس کی کفش برداری نے بخشا یہ عروج — جو گدا تھے ہو گئے آدھے جہاں کے شہریار
وہ کہ ہے جس کا خیال اک برق چھوتے ہی جسے — ہستیٔ مسلم لرزنے لگ گئی بے اختیار
وہ کہ جس کی رحمۃ للعالمینی کی طفیل — جوش میں آنے لگی ہے رحمتِ پروردگار

مسلمِ بیچارہ کے حق میں اسی کے فیض سے
صرف رجعت ہو رہی ہے گردشِ لیل و نہار

میں نے دیکھا ہے سیناؔ[1] کی گزرگہ سے تجھے — بہ رہا ہے جس میں تیرا لاجوردی رود بار

[1] اس آبنائے سینا ہی میں سے گزرتے وقت اقبال نے یہ شعر کہا تھا ؎
ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو — جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں
لیکن یہ زمانہ اور تھا۔ اُس وقت ہمارے شاعر کو حضور سرورِ کون و مکاں کے دربار میں اُس آبگینہ کی نذر گزرانے کا حسرت اندوز شرف حاصل نہ ہوا تھا جس کی نسبت وہ کہتا ہے ؎
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں
آج اگر اس مقام سے اُس کا گزر ہوتا تو وہ مازنی کی اولاد و احفاد کے کارناموں کی یاد سے متاثر ہو کر شاید یوں کہتا ؎ جیے رہو وطنِ مازنی کے میدانو — کہ دور ہی سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

ساحلِ اٹلی کا اُدھر سسلی کے مینارے اِدھر
وہ فضا سے ہمکلام اور یہ صبا سے ہمکنار

ہیں مسلمانوں کے خوں میں پرورش پائے ہوئے
اُس کی دلکش گھاٹیاں اس کے دل آرام مرغزار

آہ وہ سسلی بسایا تھا جسے ہم نے کبھی
اندلس کی طرح مغرب میں ہماری یادگار

پرچمِ توحید اُڑتا تھا جس کے ساحل پر کبھی
اور اذانوں سے کبھی گونجے تھے جس کے کوہسار

وہ سفینہ تیرے سینے پر نظر آیا مجھے
کھائے بیٹھا ہے جو دنیا کی تباہی پر اُدھار

سندبادِ خستہ کو لپٹا ہے پیرِ تسمہ پا
تیرے کندھے پر نہیں ہے مغربی بیڑا سوار

جس کی توپوں سے ہوئے ہیں مشرقی ساحل ترے
مرگ ریزد مرگ بیزد مرگ زاد و مرگ زار

کیا نہ لہرائے گا پھر تجھ پر علَم اسلام کا
اور نہ وہ وقت آئے گا ہم کو ہی جس کا انتظار

کیا نہ ہوگا ہم میں خیرالدین پھر پیدا کوئی
جس سے ہوگی سطوتِ کبریٰ کی عظمت آشکار

کیا نہ دیکھیں گی یہ آنکھیں تا بہ پہنائے اُفق
تیری پہنائی میں اُن جنگی جہازوں کی قطار

جن کے مستولوں کے اُوپر اُڑ رہا ہوگا ہلال
با ہزاراں عز و تمکین و غرور و افتخار

جن میں ہوگی ذاتِ واحد کی عبادت صبح و شام
ہم سنیں گے جن سے پانچوں وقت اذانوں کی پکار

جن کی توپوں کی گرج لے کر رہے گی ایک دن
دشمنانِ ملتِ بیضا سے باجِ انتصار

دشتِ ہُو میں لائی ہے مجھ کو مری دیوانگی
ماسوا سے تو بھی ہو زادِ جنوں لے کر فرار

جا کے اُس سے مل جو ہے سرچشمۂ عدل و سلام — سیکھ اُس سے حق رسی اور حق نوازی کا شعار
بیکسوں اور ناتوانوں سے نہ یوں آنکھیں چرا ○ ساتھ دے اُن کا، زمانہ ہے جنہیں ناسازگار
کھا چکی ہے تیری موجوں کے تھپیڑے مدتوں — کشتیِ بشکستۂ مسلم کو اب تو پار اُتار
کر تباہ اُن کو جو ہیں فرعونِ بے سامانِ قوت — حجتِ اغرقنا کی پھر ظاہر ہو اُن پر ایک بار
خونِ مسلم جن کے مذہب نے کیا اُن پر ہدر — جن کی منطق توپ ہے یا دار یا خنجر کی دھار
جھونک کر دنیا کی آنکھوں میں مسیحیت کی خاک — ہر طرف جو کر رہے ہیں دن دہاڑے لوٹ مار

ایسے صید افگن کو ہم کرتے ہیں تیرے ہی سپرد
آڑ میں تہذیب کی ٹٹی کے جو کھیلے شکار

پیرس ۔ ۷ ۔ جنوری ۱۹۱۳ء

(۲۵)

رنگِ ظلام اور رنگِ اسلام

صوبہ پنجاب کے ایک سربرآوردہ خاندان کے ایک سربلند رکن نے جو مسلمان راجپوت ہیں اپنی جاہل اور اوہام پرست برادری کی اصلاح کے لئے ایک انجمن قائم کی ہے جس کا نام مجلس اصلاح تمدن ہے۔ اس انجمن نے اس وقت تک اپنی مسلسل مساعی سے بہت کچھ اصلاحیں کی ہیں خصوصاً شادی و غم کی تقریبوں پر جو مسرفانہ رسمیں خاندانوں کے خاندانوں کی تباہی و بربادی کا باعث ہوا کرتی تھیں اُن کا یا تو مطلقاً قلع و قمع کر ڈالا ہے۔ یا اُن میں ایک بڑی حد تک ترمیم کر دی ہے۔ اس مبارک تحریک کا خیر مقدم برادری کے روشن خیال مردوں اور بیبیوں کی طرف سے بصد تپاک و جوش ہوتا ہے لیکن پُرانی وضع کے چند خرانٹ بڈھے اور اُن کے مقلد چند قدامت پرست چھوکرے اور چھوکریاں جو اصلاح کے نام سے ہاتھ کانوں پر دھرتی ہیں۔ کوئی موقع اس چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانے کا ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔

ایک گھر میں شادی ہے۔ گھر والوں کے سر پر دقیانوسیت سوار ہے اور قدامت نوازی کی لے یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ بانسری جو سری کرشن نے برج میں کئی ہزار سال ہوئے بجائی تھی اس بیسویں صدی میں بھی کہ ہارمونیم اور پیانو کے نقرئی رسیلے پن نے گوش عبرت نیوش کے لئے نئی جنتوں کے روح پرور سامان پیدا کر دئے ہیں حقہ کی مہنال کی طرح منہ سے لگی ہوئی ہے۔ پُرانی رسمیں جن کے تصور سے بھی مذاقِ لطیف کو گھن

آتی ہے اپنے زوروں پر ہیں۔ ایک بزرگوار جو اصلاح تمدن کے بڑے ہی جوشیلے مخالف ہیں اور جن کا نام نامی اور اسم گرامی راجہ محمد اسلم خاں ہے از راہِ تعریض اس کی مصلحانہ کوششوں کا خاکہ اُڑانے میں مصروف ہیں۔ میراثی سارنگی بجا رہا ہے طبلہ پر تھاپ پڑ رہی ہے اور یہ راجہ صاحب مجلس اصلاح تمدن کی ہجو ملیح جو آپ ہی کی تشکم زاد ہے، کھرج کی لے میں یوں گا رہے ہیں :-

راجاؤں میں چرچا ہے مری کج کلہی کا سب قوم پہ ہوتا ہے اثر میری کہی کا

تخفیف کی ہوتی ہی ضرورت مجھے محسوس جب جائزہ لیتا ہوں میں شادی کی بہی کا

گنجائش اگر اکنی کی نکل آئے بجٹ میں گھٹ جائے اگر نرخ عروسی کے دہی کا

بخار نے وصول آکے چوتی کی جمائی چوکی بھی تھی کیا تخت کوئی بادشہی کا

دستورِ عمل سے نہیں مقصود ہے تزئین

پھل بھی ہمیں کچھ تو ملے اس سہرسہی کا

دل افروز بیگم اس معزز خاندان کی ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون ہیں جن کی کوششوں نے اصلاح تمدن کی تحریک کو سرسبز کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کا سخنورانہ مذاق بھی سلجھا ہوا ہے۔ شعر کہتی ہیں اور خوب کہتی ہیں اور اُن کے لطائف و ظرائف نے اُس روشن عہد کی شاندار روایتوں کو پھر زندہ کر دیا ہے جبکہ دُنیائے اسلام کا وہ نصف حصّہ جس پر جنسِ لطیف کا بلا شرکت احدے وساہمت غیرے کامل قبضہ تھا۔ ادبیات کا مطلع الانوار بنا ہوا تھا۔ اپنے منہ سے آپ کج کلاہ اور جم بارگاہ بننے والے راجہ صاحب نے مجلس اصلاح تمدن کے دستور العمل کا خاکہ اُڑانے کو تو اُڑا لیا لیکن بے چارے کو یہ معلوم نہ تھا کہ اُن کے ترانے زنانخانے میں بھی پہنچ رہے ہیں اور دل افروز بیگم بھی کان لگا کر اُن

کی ہجو ملیح سُن رہی ہیں۔ راجہ محمد اسلم خاں بھی اپنے سرگم کے نشہ ہی میں جھوم رہے ہیں۔ کہ ایک میراثن آتی ہے اور ڈھولک لے کر بیٹھ جاتی ہے اور زوبل کی نظم گانے لگتی ہے۔ جو ول افروز بیگم کی حاضر جوابی کا اعجازی کرشمہ ہے۔ میراثن چونکہ بیگم سے کنیزانہ تعلق ہے اس لئے لکھی پڑھی بھی ہے جس کاغذ کے پرچہ پر بیگم نے نظم لکھ کر دی ہے۔ اُسے سامنے رکھ لیا ہے اور ڈھولک بجا بجا کر اس طرح نغمہ سرا ہوتی ہے:۔

بگڑتے ہیں جگانے سے یہ فطرت رانگھڑوں کی ہے
تعجّب اس میں کیا عادت یہی سوتے ہُوؤں کی ہے

گر اصلاحِ تمدّن کا بتایا جائے گُر اُن کو
اُنہوں نے اس میں پھر طعن کی رہ رہ کے ٹھونکی ہے

نہائیں عورتوں میں، یہ کہاں کی آدمیّت ہے
یہ سُنّت شاید اگلی ہوتری کے پالکوں کی ہے

وہی سب بیبیوں نے مل کے تھوپا آپ کے سر پر
چٹانے کے لئے باقی کسر اب بلّیوں کی ہے

اُنڈیلا مشک بھر پانی بدن پر آ کے سقّے نے
بھلا کہئے تو دقیانوس کی یہ مشق کیوں کی ہے

جو ہے صابون سے نفرت "گل خوشبو" ہی مل لیجے
پچا سعدی نے جو سوغات بھیجی گلرخوں کی ہے

کوئی پُوچھے کہ جب حمام بھی موجود ہے گھر میں
بنائی وضع یُوں پھر آپ نے کیوں مسخروں کی ہے
کہ ہے چوکی اک آنگن میں اور اُس پر آپ بیٹھے ہیں
اور اُس کے گرد فوج اک نائنوں اور گائنوں کی ہے
یہ زنگار رنگ تاگا کیوں لپیٹا ہے کلائی میں
یہ تقلید مرصّع کیا ہماری چوڑیوں کی ہے
نگار آرائیاں سیکھی ہیں کس سے آپ نے ایسی
یہی تعلیم کیا اسلام اور اسلامیوں کی ہے

ڈومنی یہ نظم جس کو سُن کر اہلِ دل وجد میں آجاتے ہیں گاتی ہے اور راجہ محمد اسلم خاں بھی کسی قدر سمجھتے ہیں لیکن ازبسکہ آپ خیر سے اُس حیوان غیر ناطق کے نام کی رعایت سے جس کی ضد اور ہٹ مشہور ہے، ذرا بخلول واقع ہوئے ہیں لہذا نظم کی سچی حقیقتیں گو وہ اُس کڑوی گولی کے مشابہ ہوں جس پر شکریں غلاف چڑھا ہوتا ہے، آپ کے حق میں بکائن اور اندرائن بن جاتی ہیں۔ آپ جھٹ سخافت طبع سے یہ شعر موزون کرتے ہیں اور میراثی کو حکم دیتے ہیں کہ طبلہ کو طبل بنا کر نہایت بلند آہنگی سے ادا کرے :۔

اس استدلال سے اپنی تشفی ہو نہیں سکتی
یہ باتیں عورتوں کی ہیں یہ منطق دل جلوں کی ہے
یہ رسمیں وہ ہیں جن سے شادیوں کا ہے بھرم قائم

چلیں گے ہم اسی پر یہ ڈگر اپنے بڑوں کی ہے ○

دل افروز بیگم اس کا ترکی بہ ترکی جواب اپنی ماما کے ہاتھ ان دو سامعہ نواز اشعار میں بھیجتی ہیں :-

مری باتوں کو سُن سُن کر باندازِ فلاطونی
جواب ارشاد ہوتا ہے کہ یہ سُنّت بڑوں کی ہے
چہ خوش ! اب آپ پُوجیں گے بُتوں کو بھی یہی کہہ کر
کہ یہ رسمِ مقدّس بھی اُنہی پیشینیوں کی ہے

لاہور یکم دسمبر ۱۹۱۶ئہ

(۲۶)

اخبار نویس کی مشکلات کا دورِ اوّل

نمونہ باز

پھٹکری سے مجھ کو مطلب ہے نہ ہڑّے سے غرض

رنگ بے داموں ہی اس دامن میں چوکھا آئے گا

کارڈ اک بیرنگ لکھا ہے نمونہ کے لئے

بند ہو کر ڈاک میں اخبار مفت آ جائے گا

اک نئے پرچہ کی میں ہر روز کر لیتا ہوں سیر

یوں ہی قاصد سال بھر نامہ پہ نامہ لائے گا

کونڈی ڈنڈا مجھ رنگیلے کا سلامت چاہیئے

بھنگ ہر چیلے مرا داتا مجھے پلوائے گا

ہے غرض پرچہ سے، مطلب اُس کے مالک سے نہیں

مجھ کو اس سے کیا وہ اس کو کس طرح چھپوائے گا

کاغذی کا بل کرے گا کس طریقہ سے ادا
اور چھپائی کے لئے پیسے کہاں سے لائے گا
ڈاک خانہ سے وہ کیا دے کر خریدے گا ٹکٹ
پھر وہ کن وعدوں سے بھڑکے عملہ کو پرچائے گا
بال بچوں کے لئے کاٹے گا کس کے پیٹ کو
اُن کو کیا کھانے کو دے گا اور وہ خود کیا کھائے گا
قوم کا مخدوم ہے خدمت ہے جس کی اُس پہ فرض
اس سے بڑھ کر کیا صلہ قوم حزیں سے پائے گا
فرض ہے اُس کا صبوحی میری پلوائے مجھے
بالیاں بی بی کی بیچے پرچہ بھجوائے مجھے!

لاہور۔ ۲۔ دسمبر ۱۹۱۶ء

(۲۷)

اخبار نویس کی مشکلات کا دورِ ثانی

نادہند

کولمبو سے زبان انگریزی میں ایک رسالہ نکلتا ہے جس کا نام "پیپلز میگزین" ہے۔
نادہند خریداروں نے اس رسالہ کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ ایک اپیل میں جو اُس نے اپنے
معاونین کے نام شائع کیا۔ وہ ایک پادری صاحب کی داستان بطور تمہید قلمبند کرتا ہے۔
پادری صاحب نے ایک دن منبر پر جلوہ افروز ہو کر ایک نہایت عالمانہ خطبہ ارشاد فرمایا
اور خاتمہ پر اس خیال سے کہ سامعین کے بٹوؤں کی گرہ اُن کے ناخن بلاغت سے کھلی
نہیں تو ڈھیلی ضرور ہو گئی ہو گی۔ مغربی رسم کے مطابق ٹوپی سر سے اُتاری اور وعظ سننے
والوں میں اُسے گشت کرایا کہ ہر شخص حسب توفیق اکنّی دوئنّی چونّی روپیہ اشرفی اس میں
ڈال دے۔ جب ٹوپی چکر لگا کر پادری صاحب کے پاس واپس آئی تو یہ دیکھ کر کہ اس میں
ایک جھنجی کوڑی بھی نہیں ہے آپ بے تحاشہ سجدہ میں گر پڑے اور خداوند یسوع مسیح کا شکر
ادا کیا کہ اُن کے فضل و احسان سے کم از کم آپ کی ٹوپی تو آپ کو واپس مل گئی۔
یہ دلچسپ حکایت سنا کر "پیپلز میگزین" کا ایڈیٹر لکھتا ہے :۔
"بعینہٖ یہی حالت آج کل ہم اخبار نویسوں کی ہے"۔ اور آخر میں ایک مشہور انگریزی
نظم کا جو "اے سام آف لائف" (سرودِ حیات) کے عنوان سے مزین ہے اپنے
حسب حال یوں خاکہ اُڑاتا ہے :۔

Lives of poor men oft remind us.
Honest toil don't stand a chance.
The more we work we leave behind us
Bigger patches on our pants.
On our pants once new and glassy.
Now are patches of different hue.
All because subscribers linger.
And won't pay up what is due.
Then let all be up and doing.
Send in your mite be it so small.
Or when the snows of winter strike us.
We shall have no pants at all.

اس نظم کا اردو آپ ورنگ ملاحظہ ہو :-

کرتا ہے چچا سے گلہ بے مایہ بھتیجا　　ملتا نہیں کچھ بھی مجھے محنت کا نتیجہ
کی مجھ سے اب اخبار نویسی نہیں جاتی　　چکّی سحر و شام یہ پیسی نہیں جاتی
گھٹنے مرے ہاتھوں میں نہ دیکھو گے تم اتنے　　پتلون میں پیوند نظر آتے ہیں جتنے
اُجلی بھی نئی بھی تھی کبھی مری یہ پتلون　　کچھ روز سے بدلا ہے مگر اس نے نیا جُون
پیوند نے ہر ہفت کیا میرے سرین کو　　ملتا نہیں یہ نُور قلندر کی جبیں کو
چندہ نہیں دیتے ہیں خریدار ہمارے　　پھر کیوں نہ الگ پودے ہوں تار ہمارے
بھجوائیے اخبار کا باقی ہے جو چندہ　　گر آپ کو ہے ہم کو بھی ہے پیٹ کا دھندا

پہلے ہی کتر بیونت سے پتلون ہے چھوٹی
ایسا نہ ہو جاڑوں میں یہ بن جائے لنگوٹی

○ لاہور ۔ دسمبر ۱۹۱۶

(۲۸)

وُہ اور ہم

"ستارۂ صبح" کی ادارت کے فرائض کی انجام دہی میں علامہ عبداللہ العادی میرے مددگار اوّل اور مولانا خواجہ عبدالحی مددگار دوم تھے۔ لاہور کے ایک رئیس نے یہ دیکھ کر کہ "ستارۂ صبح" بڑی کامیابی سے چل رہا ہے اس کے مقابلہ میں اپنا ایک نیا اخبار "الصباح" کے نام سے نکالنے کا ارادہ کرلیا۔ اور علامہ عبداللہ العادی کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر "ستارۂ صبح" کے ادارہ سے توڑ لینے میں کامیاب ہوگئے۔ "الصباح" نے اپنا بازار گرم کرنے کے لئے "ستارۂ صبح" سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی اور اعلانِ جنگ اپنی ۶۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں یوں کیا:۔

صبوحی کے چند قطرے

دہقانِ مے فروش کی چشمِ سیاہ مست
اب تو مئے طہور کو دینے چلی شکست

اسلام اُس کے نازکا مشرقِ انصرام
الحاد اُس کی شان کا ممنون بندوبست

شیخ اُس سے شادکام تو رندانِ اس کے ہیں غلام
معشوقِ ما بشیوۂ ہر کس موافق است

با ما شراب خوردو بزاہد نماز کرد

اس کا جواب اگلے دن میں نے "ستارہ صبح" میں یوں دیا :۔

شیشہ الحاد میں تقویٰ کی پری

سنا ہے کہ اتری ہے شیشہ کے اندر　　نئی اک پری نام ہے جس کا تقوےٰ
پلاتی ہے بھر بھر کے جامِ صبوحی　　کہ ہو اس کی تاثیر سے چشمِ حق وا
کروں میں بھی اس شیشہ کی سیر لیکن
مجھے ڈر ہے مجھ کو نہ ہو جائے لقوہ

علامہ عمادی ان تین نشتروں کی خلش سے بے تاب ہو گئے اور "الصباح" کی اگلی اشاعت میں اپنی ترکش ادب سے چند تیر نکالتے ہوئے میرے دل کی تواضع اس طرح فرمائی

اب تک تو یہ سمجھے ہوئے تھے آپ کے دل سوز　　ہے مسخرگی بزمِ حریفاں میں دل افروز
اب آپ کو وعظوں میں بھی اصرار ہے اس پر　　اللہ و نبی پہ بھی کوئی وار ہو دل دوز
مذہب کی یہ تضحیک ہو یہ بے ادبی ہو　　پھر کیوں نہ ہو ملت کے تو ہیں آپ ادب آموز
بھانڈ آپ اگر بننے چلے شوق سے بنئے　　منبر پہ ہے کس واسطے وعظ ستم اندوز
رو مسخرگی پیشہ کن و ہزل بیاموز　　"تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی"

اس کا جواب ۹۔اکتوبر کے "ستارۂ صبح" میں بالفاظ ذیل شائع ہوا :۔

اللہ کی قدرت کا تماشا ہے کہ کل تک　　الزام وہ دیتے تھے مجھے بت شکنی کا

کہتے تھے اس امرت کی ہر اک بوند میں ہے زہر | ہوتا تھا جو چرچا مری شیریں سخنی کا

مرتے تھے خود اُس طفل برہمن کی ادا پر | جس کا مزہ ہمزاد ہے نیزے کی انی کا

لیتے تھے مزے اُس لبِ جاں بخش کے دن رات | ہوتا ہے گماں جس پہ عقیقِ یمنی کا

ٹپکے مرے آنسو بھی جب اُس طفل کے غم میں | اور اُن کو ملا مرتبہ ہیرے کی کنی کا

افسانہ سنایا مرے دل نے بھی تڑپ کر | جب اُس نگہ ناز کی ناوک فگنی کا

سوجھا اُنہیں یہ طعنۂ نو رستہ یکایک | دشمن ہے یہ کم بخت رسولِ مدنی کا

مذہب سے ہے بیزار یہ گمراہ اور اسلام | ہے شکوہ گزار اس کی دریدہ دہنی کا

منصب مجھے ہوتا ہی عطا از رہِ الطاف | الحاد کے دربار کی صدر انجمنی کا

فرماتے ہیں اسلام کا رستہ نہیں محفوظ | بے چارے مسافر کو ہے ڈر راہ زنی کا

گھر گھر مری یزداں شناسی کی پڑی دھوم | نظارہ بنے آپ مری اہرمنی کا

دونوں سے کیا آپ کے احساں نے سبکدوش | رکھا نہ مجھے دیں کا نہ دنیائے دنی کا

اک جانِ حزیں رہ گئی لے لیجئے وہ بھی
حق اس پہ ہی کیا آپ کے گردن زدنی کا

علامہ عمادی کے قلب صافی پر ان اشعار کا بے حد اثر ہوا جن رئیس صاحب کی فریبندگی "ستارہ صبح" سے آپ کی علیحدگی کا باعث ہوئی تھی اُس سے آپ نے فوراً قطع تعلق کر لیا اور "ستارہ صبح" کے ادارہ میں واپس آکر پہلے کی طرح میرے ادبی رفیق بن گئے۔

(۲۹)

"ستارۂ صبح"

سر رشتہ رقابت مطبوعات کی احتسابی زد میں

ڈاکٹر کھچڑی کھلاتا تھا مگر اُبلی ہوئی
ایک مُدت سے غذا ملتی تھی پرہیزی مجھے

میرے سالن میں نمک تک بھی نہ پڑتا تھا کبھی
خود بھی کڑوانے لگی تھی مرچ کی تیزی مجھے

لیکن اب ارشاد ہوتا ہے کہ کھچڑی بھی ہے منع
کیونکہ اس میں بھی ہے خوفِ فلفل آمیزی مجھے

راہ چلتے چلتے خود اُٹھ کر لپٹ جانے کو ہے
جھاڑ ہو کر میرے مضموں کی دل آویزی مجھے

میرے موٹی کوڑیوں کے بھاؤ بک جانے کو ہیں
نفع پہنچانے کو ہے میری گہر ریزی مجھے

نیلؔ ہی میں بیچ لینا فارسی آتی اگر
میری قسمت نے پڑھا دی ناحق انگریزی مجھے

اے خدا فلیستنجیبولی کی ہے تفسیر کیا
کام کس دن دے گی یہ میری سحر خیزی مجھے

سنہ ۱۹۱۷ء
لاہور - ۱۷ - اکتوبر

(۳۰)

متصوّفانہ کنکوّے بازی

کرلیا میں نے انتظام ڈور کا اور پتنگ کا
چاہیئے مجھ کو اب فقط ایک پیالہ بنگ کا

حلقۂ گردن نیاز بن گئے گیسوئے دراز
قطع ہُوا ہے سلسلہ شرع کے پالہنگ کا

حیّ علی الفلاح کا حکم مُرید کے لئے
پیر کو خود ہے مشغلہ بربط و نائے و چنگ کا

اب نہ وہ با صفا رہا اور نہ وہ ما کدر رہا
زمزمیوں کے جام میں نام ہے آب بنگ کا

کشورِ نُور پر کیا خیلِ ظلام نے خروج
ڈال دیا ہی شیشہ سے سنگ نے ڈھنگ جنگ کا

وہم ہُوا ہی سرنگوں عقل ہُوئی ہے سرفراز
آئنہ کو نہیں رہا وسوسہ کچھ بھی زنگ کا

راہ تو ہے یہ مستقیم ہم ہی مگر نہیں قویم
مرحلۂ نجات کو عذر ہے پائے لنگ کا

لاہور ۔ ۸ ۔ نومبر ۱۹۱۷ء

(۳۱)

طریقت کا کلام اللہ

سمرقند میں ایک صوفی بزرگ ابو اللیث گزرے ہیں جنہوں نے ارباب طریقت کے افادہ کے لئے ایک قرآن تصنیف فرمایا تھا۔ جناب ابو اللیث نے وہ تمام آیات کاملہ درج فرمائی ہیں جو جناب باری نے عرش بریں پر معراج والی رات بدون وساطت جبریل امین اپنے رسول مقبول پر اتاری تھیں۔ طریقت کے اس کلام اللہ کا ایک نسخہ لاہور کی اورینٹل لائبریری میں موجود ہے۔ علامہ اقبال نے اس پر تبصرہ کرنا شروع کیا تھا اور اگر یہ دلکشا تبصرہ شائع ہو جاتا تو مسلمانوں کو معلوم ہو جاتا کہ مکی و مدنی قرآن کی زبان اور سمرقندی قرآن کی زبان میں کیسے کیسے مزے کے فرق ہیں۔ لیکن ہندوستان بھر کے ارباب طریقت نے اس زمانہ میں "ستارہ صبح" کی قائم ہوئی تحریک کے اور میرے خلاف جو اعلان جنگ کر رکھا تھا غالباً اس کے شور و غوغا سے متاثر ہو کر علامہ ممدوح نے اپنے تبصرہ کی اشاعت کا قصد ملتوی کر دیا۔ اشعار ذیل کا ثواب ہندوستان کے حلقہ متصوفین کرام کی نذر کیا جاتا ہے:۔

کلام اللہ کی میں بھی تلاوت روز کرتا ہوں   مگر اس کے مصنف ہیں ابو اللیث سمرقندی

مری آنکھوں میں نقش مانی و بہزاد پھرتا ہے   مرا مسلک ہے ارژنگی مرا مشرب ہے پاژندی

دکھا دو جلوہ کثرت کا مجھے وحدت کے پردے میں

کہ شرع مصطفیٰ کی ہو سکے مجھ سے بھی پابندی

سنہ ۱۹۱۷ء
لاہور ۱۲۔ نومبر

(۳۲)

عقلِ جنوں خیز

ہے جستجو دوا کی دلِ دردمند کو
اور پھر دوا بھی وہ جو ہو پرہیز کے بغیر

بے لطف ہے فسانۂ گل و عندلیب کا
شیراز و مرو و مشہد و تبریز کے بغیر

سرمایۂ حیات ہے پیرایۂ نشاط
جینا عبث ہے طبعِ طرب خیز کے بغیر

لوں نامِ مصطفیٰ ہی کہ آتا نہیں قرار
اِس قصۂ لذیذ و دل آویز کے بغیر

ظلمت ہی زیبِ نور، کہ بزمِ رسول کی
رونق نہیں ہے خسرو پرویز کے بغیر

خمخانۂ جہان کے مستوں کی زندگی
بیکار ہے ایاغ مئے تیز کے بغیر

دیوانگی نہ ہو تو یہ فرزانگی نہ ہو
مسلم ہے ہیچ عقلِ جنوں خیز کے بغیر

سارے جہاں کی پیاس بجھانی محال ہو
اسلام کے پیالۂ لبریز کے بغیر

لاہور ۱۴۔ نومبر ۱۹۱۷ء

(۳۳)

حکم و حکمت

جب محمدؐ کو ملا پیغام اکملتُ لکم
کُل ہمیشہ کے لئے شمع نبوّت ہو گئی

آسماں نے حکم کا انعام حکمت کو دیا
حق کی حُجت ختم ہو کر حق کی رحمت ہو گئی

مصطفےٰ ہیں گلشن توحید مسلم بوئے گل
خود وہ ہیں خیر البشر خیر اُن کی اُمّت ہو گئی

ماہِ نو کی کیا ضرورت بدرِ کامل کی شبیہہ
جب کلام اللہ کی ایک ایک آیت ہو گئی

پھر یہ ہم سے پوچھتے ہیں آرہا ہے کیوں عذاب
اللہ اللہ آپ لوگوں کی یہ حالت ہو گئی

لاہور۔ ۱۷۔ نومبر ۱۹۱۷ء

(۳۴)

مدینہ کے ایک کبوتر کی یاد میں

جسے علامہ اقبال کے ارادت کیش ہاتھوں نے پالا تھا مگر ۲۰۔ نومبر ۱۹۱۷ء
کو ایک بلی کا شکار ہو گیا۔

رحمت ہو تیری جان پہ اے مرغِ نامہ بر
آیا تھا اُڑ کے ذروۂ بامِ حرم سے تُو

انداز جبرئیل تھا تیری اُڑان میں
کرتا نہ کیوں حدوث کو پیدا قدم سے تُو

زمزم میں تر ہوئی تری منقار نغمہ ریز
کرتا رہا عرب کو نمایاں عجم سے تُو

جاں کو بسا دیا تھا شمیمِ حجاز میں
لایا تھا تار توڑ کے زلفِ صنم سے تُو

ہم کو دیا پیام الف لام میم کا
ناآشنا نہ تھا رہ و رسمِ الم سے تُو

نفرت ہی آشیانہ ہستی سے تھی تو کیوں
آیا اُتر کے طارمِ کاخِ عدم سے تُو

تجھ پر ابوہریرہ بھی قربان ہوں کہ تھا
وابستگانِ دامنِ شاہِ اُمم سے تُو

شاید اُنہی کی راہ میں تُو ہو گیا نثار
گر بچ سکا نہ گربہ کی مشقِ ستم سے تُو

لاہور۔ ۲۲۔ نومبر ۱۹۱۷ء

(۳۵)

قافلۂ اسلامیانِ ہند کا سالارِ اعظم

کیا لئے پھرتا ہی اے چرخ اپنے مہر و ماہ کو ‏ ‏ ‏ تو نے دیکھا بھی نظام الملک آصف جاہ کو

آج وہ اُس قافلہ کا ہند میں سالار ہے ‏ ‏ ‏ کہکشاں نے پا لیا تھا جس کی گردِ راہ کو

جس کی رحمت کر گئی حل ایک عالم کے لئے ‏ ‏ ‏ عقدۂ دستِ فراخ و دامنِ کوتاہ کو

ذرہ جس کی مکرمت سے مہر انور ہو گیا ‏ ‏ ‏ کر دکھایا کوہ جس کی تمکنت نے کاہ کو

جس کا حکمت کا محیط اتنا عمیق و ژرف تھا ‏ ‏ ‏ وہم کا غواص اعظم بھی نہ پہنچا تھاہ کو

نعمتِ توحید جس نے عام کی سب کے لئے ‏ ‏ ‏ لا بٹھایا ایک محفل میں گدا و شاہ کو

جس نے جانا تھا اِدھر وجہِ رسول اللہ کا

جس نے مانا تھا اُدھر پروردگار اللہ کو

لاہور یکم دسمبر ۱۹۱۷ء

(۳۶)

تاجدارِ دکن

میر عثمان علی خاں مدظلہ العالی

۱۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو اعلیٰ حضرت آصف جاہ ہفتم خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کی طلبی پر میں دہلی پہنچا اور شرفِ باریابی حاصل کیا۔ نظم ذیل اس سعادت اندوز تقریب پر حوالۂ قلم کی گئی اور اعلیٰ حضرت نے اسے شرفِ پذیرائی بخشا۔

روشنی شمع کو دی جس نے شبستاں کے لئے
مصطفائی مجھے بخشی مرے ایماں کے لئے

عالمِ قدس سے اک نور چلا آتا ہے
میرے دیوان کی آرائشِ عنواں کے لئے

یہ ہی نورِ علی نور ہے پرتو جس کا
کبھی سینا کے لئے تھا کبھی فاراں کے لئے

جھلملایا کبھی بت خانۂ دل میں آکر
جگمگایا کبھی آتش کدۂ جاں کے لئے

بن گیا ہے یہ کبھی رونقِ صحرائے عرب
کبھی زینت ہے عجم کے چمنستاں کے لئے

نسبتیں ہیچ ہیں اسلام کے سارے آگے
کہ شرف سب سے بڑا تھا یہی سلماں کے لئے

آسماں ہو کہ زمیں عالم و ما فی العالم
سچ جو پوچھو تو یہ سب کچھ ہے مسلماں کے لئے

جان کی حضرت باری میں بچھا دی جس نے
وقف ہے جس کی جبیں درگہ یزداں کے لئے

ملک پر جو ہے فدا قوم پہ جو ہے قرباں
سر بکف ہے جو اولی الامر کے فرماں کے لئے

جس کے دل میں ہے ارادت کے تقاضے سے جگہ
دکن اور اُس کے خداوند کے احساں کے لئے

میں بھی پہنچا تو وہاں تک ہوں مگر نذر ہو کیا
بڑی مشکل ہے یہ مجھ بے سر و ساماں کے لئے

پادشاہی اُسے حاصل ہے فقیری مجھ کو
تحفہ کیا لے کے گدا جائے گا سلطاں کے لئے

ایک دولت مرے دامن میں ہے لیکن موجود
دین اسلام کے اس حامی ذیشاں کے لئے

دلِ ناشاد میں ہے ملّتِ بیضا کی تڑپ
وُہی لایا ہوں میں عثمان علی خاں کے لئے

دہلی۔ ۱۸ جنوری ۱۹۱۸ء

(۳۷)

علی گڑھ میں حضور نظام کا قدوم میمنت لزوم

اے علی گڑھ بخت ہوتا ہی ترا بیدار آج
تیرے گھر آیا ہے چل کر قوم کا سردار آج

تیری قسمت کی گرہ کھلنی تھی آخر کھل گئی
ہو گیا آسان تیرا عقدۂ دشوار آج

جگمگا اٹھے حرم کے بام و در جس نور سے
اس سے روشن ہو گئے تیرے در و دیوار آج

کشتیٔ اسلام کو مل ہی گیا اک ناخدا
ہو گیا آخر مسلمانوں کا بیڑا پار آج

بند جس بستی میں تھی کل تک دکان اسلام کی
گرم ہوتا ہے امانت کا وہاں بازار آج

صحن کالج روکش چرخ مکوکب ہو گیا
ہو گئے پیش نظر سب ثابت و سیار آج

آ گئے گردش میں اسلامی اخوت کے ایاغ
مست بھی ہم کو نظر آنے لگے ہشیار آج

جھوم کر اٹھی دکن سے اک گھٹا ایثار کی
اور وہ برسی ہم پہ بن کر ابر گوہر بار آج

ہے گراں ارباب نظر کو شوکت دیں کی تلاش
دیکھ لیں آ کر نظام الملک کا دربار آج

جوش میں رہ رہ کے آیا ہے خمستان دکن
بادشہ ساقی بنا اور ہیں گدا میخوار آج

میر عثمان علی خاں پہ خدا کی رحمتیں
ہم سے پورا جس کی دولت کا ہوا اقرار آج

۱۸۔ فروری ۱۹۱۸ء

(۳۸)

شریعت اور طریقت کی آویزش

سر مائیکل اوڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب کی ستم پیشہ ملوکیت نے "زمیندار" کو بیند ورکھا رکھا تھا اور مجھے نیم نظر بندی کی حالت میں اپنا ادبی شوق پورا کرنے کے لئے روزنامہ ستارۂ صبح کی ادارت کے فرائض کی انجام دہی کی اجازت دے رکھی تھی۔ سیاست اُن ایام میں میرے لئے شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی تھی۔ اور "ستارۂ صبح" کے اوراق صرف غیر سیاسی مضامین کے لئے وقف ہونے پر مجبور تھے۔ تاریخ۔ فلسفہ۔ اقتصاد۔ معاشرت۔ مذہب اور ادب لطیف وہ موضوع تھے جن سے میں اپنا دل بہلا سکتا تھا میں نے اس کو بھی غنیمت سمجھا اور ارباب ذوق سلیم کے لئے علم و حکمت کی ایک نئی بستی بسا دی جس کے بام و در کتاب و سُنّت کی روشنی سے جگمگا اُٹھے۔ نقلی صوفیوں اور جھوٹے پیروں کا پول "ستارۂ صبح" میں کچھ اس طرح کھولا گیا کہ دنیائے طریقت کے بزعم خود غلط رہنما چیخ اُٹھے چنانچہ میرے خلاف ان بزرگوں نے ایک وسیع پیمانہ پر سازش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح میں اُن کے راستہ سے ہٹ جاؤں۔ پہلے تو لاہور میں ایک عوام عامی جلسہ کیا جس میں مجھ پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا جو اب تک واپس نہیں لیا گیا۔ اس پر بے اختیار میرے منہ سے نکلا:۔

کوئی دامن لے گیا کوئی گریباں لے گیا کوئی ٹرکی لے گیا اور کوئی ایراں لے گیا

وہ بھی ہم سے چھین کر حامد رضا خاں لے گیا رہ گیا تھا نام باقی اک فقط اسلام کا

اس کے بعد ایک میموریل تیار کیا گیا جس پر طول وعرض ہند کے پیروں اور صوفیوں اور سجادہ نشینوں کے دستخط ثبت تھے۔ اس میموریل میں حکومت پنجاب سے استدعا کی گئی تھی کہ کسی طرح میرا منہ بند کیا جائے۔ یہ اُسی میموریل کا نتیجہ تھا کہ مجھے پنجاب چھوڑنا پڑا اور کچھ عرصے کے لئے حیدر آباد جا کر اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں کے دامن دولت میں پناہ لینی پڑی۔ اگرچہ حیدر آباد میں بھی حریفوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور مجھے اُس گوشۂ عافیت کو بھی چھوڑ کر پنجاب کا رُخ کرنا پڑا۔ جہاں نئی بلائیں میرے استقبال کو موجود تھیں۔ لیکن یہ ایک جداگانہ داستان ہے۔ ذیل کی نظم میں انہی واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

ڈرا رہے ہیں وہ اپنے میموریل سے مجھے
ستارہ صبح کا ہُوں ڈر ہو کیا زحل سے مجھے

ملی ہے دینِ محمدؐ کی سرمدی دولت
یہ زندگی ہو تو کیا خوف ہو اجل سے مجھے

جگر کے راز سے آنکھ آشنا ہُوئی ہی نہیں
نکالنا ابھی طوفاں ہو اک بغل سے مجھے

مجھے بھی نکتۂ تصوّف کا ایک ہے معلوم
کہ لکھنے آتے ہیں مضمون دستِ شل سے مجھے

مرا یہ ہاتھ ہے اور دامنِ نبیؐ ہے
یہ لازوال سعادت ملی ازل سے مجھے

مَیں آفتاب ہُوں اسلام آسماں ہو مرا
وُہ پھر دکھاتے ہیں کیوں روشنی کنول سے مجھے

نظامِ مصطفوی کا مَیں ایک عنصر ہُوں
ہراس کس لئے ہو پھر کسی خلل سے مجھے

اگرچہ پست ہُوں فطرت ہو ارجمند مری
ملا یہ رُتبہ خداوندِ عزّ وجل سے مجھے

حدیث نے مجھے پہنچا دیا ہو قراں تک
کہ ذوقِ علم میسّر ہُوا عمل سے مجھے

سمجھ میں آئی ہو اب رمزِ کُلّ یوم کی
خجستہ تر نظر آتا ہے آج کل سے مجھے

حضورِ احمدِ مرسل کا سایہ ہے سر پہ
ہُما سے کہہ دو نہیں کام ہو رچھل سے مجھے

(۳۹)

دُنیا اور دُنیا والوں کا نقشہ

کھینچوں میں اس انداز سے برسات کا نقشہ — آنکھوں میں پھرے جس سے طلسمات کا نقشہ

حاجت نہ رہی کچھ بھی سکندر کو خضر کی — ہے سامنے لٹکا ہوا ظلمات کا نقشہ

ابرِ کرم آیا ہے کھُل اے چشمِ بصیرت — اور دیکھ لے اللہ کی آیات کا نقشہ

گلشن میں بہار آئی ہری ہو گئی ہر شاخ — یہ اسم کی تصویر ہے وہ ذات کا نقشہ

چلتے ہوئے طوفان میں ہر دید کے قابل — قدرت کے عناصر کے فسادات کا نقشہ

رونا ہی اُدھر ابر تو ہنستی ہے اِدھر برق — ہے خوب زمانہ کے یہ حالات کا نقشہ

جب بوٹ کی ٹھوکر سے گرائیں تو وہ بولے — کیا صاف کھنچا ہی یہ مری لات کا نقشہ

دُنیا جسے کہتے ہیں وہ ہے بازیٔ شطرنج — ہر چال میں کھنچتا ہی یہاں مات کا نقشہ

کیا دیکھتے ہو چرخ ستمگار کی صورت!! — لٹکا ہے بلندی پہ اک آفات کا نقشہ

جو دوست ہیں منہ پہ وہ پسِ پشت ہیں دشمن — [illegible] یہ ہی لوگوں کی ملاقات کا نقشہ

پانی کے عوض ہوتی ہے وِسکی سے تواضع — اس دَور میں بدلا ہے مدارات کا نقشہ

دُنیا میں جو ہیں دین کے ارکانِ خصوصی — کھنچتا ہی کچھ اب اُن کے بھی حالات کا نقشہ

اس عہد کے اشرار ہیں طاغوت کی صورت — اس دَور کے اخیار ہیں طامات کا نقشہ

دن رات اُڑاتے ہیں مزے حضرتِ واعظ ○ دلکش ہے بہت آپ کے اوقات کا نقشہ

ظاہر میں تو مسجد کی ہے محرابِ مقابل ○ دل میں ہے مگر خلد کے باغات کا نقشہ

حوروں کی دُعا مانگتے ہیں پڑھ کے نمازیں — خالی نہیں علّت سے مناجات کا نقشہ

تعویذ مریدوں کو دیا کرتے ہیں لکھ کر — یُوں کھینچتے ہیں اپنی کرامات کا نقشہ

ارشاد یہ ہوتا ہے کرو خدمتِ مرشد — مخصوص یہ ہے اُن کی ہدایات کا نقشہ

فرصت نہیں اورادِ ریائی سے کسی وقت — اک رنگ پہ رہتا ہے عبادات کا نقشہ

صد سالہ ہیں ڈاڑھی ہی بڑی سر بھی گُھٹا ہے — دیکھے تو کوئی قبلۂ حاجات کا نقشہ

یہ شکل یہ اشغال یہ اعمال یہ افعال — یہ عہد ہے محشر کی علامات کا نقشہ

کچھ ان میں ہیں اللہ کے بندے بھی مگر کم — اشعار میں ہے عام خیالات کا نقشہ

کھینچا تو ہے محنت سے مگر خوف یہی ہے
کہہ دیں گے اسے آپ خرافات کا نقشہ

لاہور یکم ستمبر ۱۹۱۸ء

(۴۰)

ربِّ کعبہ کا لُطفِ عام

گجر دم آج مسلموں کو یہ جاں پرور پیام آیا
کہ تم سب جس کے متوالے ہو گردش میں وہ جام آیا

قبائے ملتِ بیضا کو جن ٹکموں کی حاجت تھی
شہیدوں کے لہو کا قطرہ قطرہ اُن کے کام آیا

خدا کے تخت سے ٹکرائیں مظلوموں کی فریادیں
ستم کی روح کانپ اُٹھی کہ وقتِ انتقام آیا

سواری رہ نوردِ منزلِ اسریٰ کی جب نکلی
تو جبریلِ امیں تھامے ہوئے اُس کی لگام آیا

مرتب آپ کی جس کی ہر اک شق ربِّ اکبر نے
پیمبر عرش سے لے کر وہ دستوری نظام آیا

جھکا دیں گردنیں فرطِ ادب سے کج کلاہوں نے
زباں پر جب عرب کے ساربانزادوں کا نام آیا

رسول اللہ سے ازبسکہ نسبت خاص ہے اُن کو
مسلمانوں کے حصہ میں خدا کا لُطفِ عام آیا

لاہور - ۶ - دسمبر ۱۹۲۱ء

(۴۱)

ترک اور یورپ

گلیڈسٹن بہ حسرت کنج مرقد میں گیا لے کر
کہ یورپ سے نہ نکلے ترک بستر بوریا لے کر

یہی زہراب بھی لائڈ جارج کے زخموں سے رستا ہے
یہی داغ اپنی پیشانی پہ بونر لا مرا لے کر

قدم بڑھ کر لیے عثمانیوں کے فتح و نصرت نے
بڑھے جب ہاتھ میں جھنڈا رسول اللہ کا لے کر

شہیدوں کے سروں کی قیمت آزادی کی دولت تھی
خود آیا سر کے بل مقتل میں قاتل خوں بہا لے کر

بجز اپنے سے منہ کے یا مسلمانوں کی نفریں کے
گئے انگریز قسطنطنیہ کی گلیوں سے کیا لے کر

مسلماں ہے تو دنیا میں خدا کا نور پھیلا دے
حریم خواجۂ یثرب کی مٹی کا دیا لے کر

ع توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر انجام اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

سنہ ۱۹۲۶ء

(۴۲)

نمستے علیکم

ماہ جون ۱۹۲۶ء میں سکھر کے سنگٹھنیوں نے ایک جلسہ کیا جس میں ایک کٹر آریہ سماجی پرتاپ سنگھ نے جاتی کی نیتوں کی ترجمانی کا حق بروایت "پیسہ اخبار" لاہور یوں ادا کیا :-

ہماری زندگی کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے مذہب کو مٹ دیں۔ ہندو! گئو ماتا کے گلے پر چھری پھیرنے والوں کی طرف سے تمہارے دلوں میں رحم کا کوئی جذبہ نہ ہونا چاہئے بھیشم کے سپوتو۔ ارجن کے دلارو! اگر تم ایک گائے کی خاطر کراچی سے لے کر مانہ تک کے تمام مسلمانوں کو قتل کر دو تو بھی تھوڑا ہے۔ ہندو دھرم میں جانوروں کا گوشت کھانا منع ہے لیکن مسلمانوں کا خون حلال ہے۔ کسی ہندو کو اس کے پینے میں پس و پیش نہ کرنا چاہئے۔

اخبار "آریہ مسافر" آگرہ کے شہرۂ آفاق ایڈیٹر مہاشہ کالی چرن جنہوں نے مسلمانوں کے آقا و مولا ﷺ کو غلیظ سے غلیظ گالیاں دے کر ہندوستان کی آریائی دنیا کو اپنی تعریف میں رطب اللسان بنا لیا ہے۔ جاتی کے منصوبہ بازوں کی دوسری ٹولی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پرتاپ سنگھ کی طرح یہ مہاشے کھلم کھلا یہ تو نہیں کہتے کہ مسلمانوں کو الٹی چھری سے حلال کر کے اُن کا خون غٹ غٹ پی لینا چاہئے لیکن کعبہ کی چھت پر اوم کا جھنڈا نصب

کرنے کی فکر میں ضرور ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ اور اپنے بھائی بندوں کو یقین دلا رہے ہیں کہ عرب اور عجم کا شدھ ہو جانا چند دن کی بات ہے۔ بلکہ ابھی سے انہوں نے فرضی فسانے بھی تصنیف کرنے شروع کر دئے ہیں۔ جن میں بتایا گیا ہے کہ عرب اسلام چھوڑ کر جوق درجوق ہندو دھرم میں داخل ہو رہے ہیں۔

مولانا سید غلام بھیک نیرنگ نے جو جمعیت مرکزیہ تبلیغ الاسلام کے معتمد عمومی ہیں اپنی جمعیت کی ہشت ماہہ رپورٹ: مارچ لغایت دسمبر ۱۹۲۵ء میں مہاشہ کالی چرن کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

اخبار "آریہ مسافر" آگرہ میں عجیب و غریب عربی نما زبان میں فرضی عربوں کے فرضی مکالمات شائع کئے گئے جو "نمستے علیکم علیکم نمستے" سے شروع ہوتے تھے اور جن میں یہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ گویا عرب لوگ مسرت آمیز استعجاب کے ساتھ اقرار کرتے ہیں کہ ہم تو ویدک دھرم کے بارہ میں بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ یہ تو بڑا عمدہ مذہب ہے اور اسلام اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے

سید صاحب ایک کہنہ مشق سخنور ہیں اور حلقۂ احباب میں اپنی بذلہ گوئی اور لطیفہ سنجی کے لئے مشہور ہیں۔ تعجب ہے کہ "نمستے علیکم علیکم نمستے" کی خندہ آفریں ترکیب نے اُن کے سمندِ سخن پر تازیانہ کا کام کیوں نہ دیا۔ شاید اُن کی لیلائے شاعری تبلیغ کے محمل میں بند ہو کر رہ گئی جس کا پردہ اب قیس کے لئے بھی نہیں اُٹھتا۔ بہرحال یہ فرض کفایہ میں نے انجام دے دیا۔ ملاحظہ ہو:۔

(۱)

سُنا ہے کہ ایک آگرہ کا مسافر! اُٹھاتے ہُوئے سر پہ ویدوں کے بستے
عراقِ عرب میں پہنچ کر پکارا نمستے علیکم علیکم نمستے

کبھی بھاؤ مہنگا تھا ہندو دھرم کا ہیں لیکن اب اس جنس کے دام سستے
یہ وہ بل ہے جس میں گھسا چاہتے ہیں تمام اہلِ اسلام شدّھی کے رستے
مسخّر کریں گے عرب اور عجم کو مہا بیر دل کے گرانڈیل دستے
نہیں یوں ہی ان کی تباہی پہ ہم کو برس تین گزرے کمر کستے کستے

اگر دھوتیاں باندھ لیتے مسلماں
نہ یوں اُن پر اینٹ اور پتھّر برستے

(۲)

چو از بت پرستے شنیدا ایں سخن ہا بخندید و زد نعرہ یزداں پرستے
چہ عوعو کنی اے سگِ کوئے کاشی ہنوز اندریں بیشہ شیرِ نرا ستے
کہ سرپنجۂ سامری افگن او زخوناب گوسالہ ہا احمرا ستے
مکن تکیہ بر پارۂ سنگ و خشتے کہ ہندو سبھا را یدست اندرا ستے
مشو غافل از سیفِ مسلولِ مسلم کہ از مہرِ رخشندہ روشن ترا ستے

بیک ضربتش صد سر از تن جدا شد
بسے کافراں را، ہما ہم سرا ستے

"زمیندار" کے پڑھنے والے عراق میں بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے جب حکومت عراق کو اس نظم کے مفہوم کی طرف توجہ دلائی تو اُس نے عراقیوں اور ہندی مسلمانوں کی رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے آریہ سماجیوں کی خطرناک تحریک کا سر کچل دیا اور احکام جاری کر دئے کہ کوئی آریہ سماجی اس مُلک میں اپنا مندر نہ بنائے اور نہ یہاں شدھی کا پاکھنڈ پھیلائے۔ ان احکام کے اجرا سے آریہ مہاشوں کے گھروں میں ٹسُں پڑ گئی۔ ہندوستان میں اُنھوں نے بڑا شور مچایا اور انگریزی حکومت سے مداخلت کی التجائیں کیں مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ مجبوراً اُنہیں عراق چھوڑنا پڑا۔ اور اب آگرہ یا بغداد کہیں سے بھی سُننے میں نہیں آتا کہ "نمستے علیکم علیکم نمستے"۔

(۴۳)

سرکارِ دو عالمؐ سے التجا

نجد ترا ہے مصر ترا ہے روم ترا ہے شام ترا
ہند میں لیکن کُفر پہ غالب آنہ سکا اسلام ترا
خوفِ خدا تو اُٹھ ہی چکا تھا شرم نبیؐ کی بھی نہ رہی
مسلم ہندی دیدہ دروں نے دیکھ لیا انجام ترا
اُندلسی آپ اپنے ہی ہاتھوں ہو گئے تھے جس طرح تباہ
میٹ رہا ہے آج اُسی ڈھب سے کام ترا بھی نام ترا
غیر کے بدلے اپنے لہو کی تیرے سناں کو چاٹ لگی
پیر گیا خود اپنے جگر میں خنجر خوں آشام ترا

تاک رہا ہے بامِ حرم کو "اوم" کا جھنڈا گوکل سے
مضحکہ اُڑتا دیکھ رہے ہیں بُت کدہ میں اصنام ترا ۵

ساقیٔ یثرب میکدہ تیرا مستیٔ عالم کا ہے کفیل
بادہ ہمیں کو پھر نہیں دیتا کس لئے لُطفِ عام ترا

دینِ حجازی کی عصبیت ہم کو عطا کر از سرِ نو
کیونکہ یہی تھا جو کہ ہے اب بھی سب سے بڑا انعام ترا

لاہور - ۶ - فروری ۱۹۲۷ء

(۴۴)

سورۂ بقر کے بھول جانے کا انجام

اگر سرشار ہوتی جذبۂ توحید سے ملّت

تو اس سے مالوی جی بے سر پرخاش کیوں ہوتے

لٹھیتی کا سبق جاتی کو دیتے آ کے مونجے کیوں؟

ہماری ذلتوں کے رازِ پنہاں فاش کیوں ہوتے

اُلجھتے غازیوں سے دم بہ کیپ تھا سنگٹھنیوں میں

مقابل مہرِ عالمتاب کے خفاش کیوں ہوتے

ہماری مسندِ اقبال و دولت کے تمنائی

ہماری بزمِ رنگا رنگ کے فراش کیوں ہوتے

پیمبرؐ کو یہ مُنہ پھٹ آریہ لکھتے "رنگیلا" کیوں

شر یہ اس درجہ آج اس وضع کے اوباش کیوں ہوتے

تمسخر کیوں اُڑاتے صبح و شام اسلام والوں کا
دلیراتنے "ملاپ" اور "تیج" اور "پرکاش" کیوں ہوتے
"لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں ہم کو"
یہ نقشہ سامنے تھا ورنہ ہم نقاش کیوں ہوتے
نہ پھنستے سود کے چکر میں لے کر قرض بنئے سے
تو ہم خیر الامم کہلا کے یوں قلاش کیوں ہوتے
تمہیں گر یاد ہوتی سورۂ بقرہ اے مسلمانو
تو سانڈھنیوں کی ہنڈیا میں بگھارے ماش کیوں ہوتے

لاہور ۲۴ فروری ۱۹۲۷ء

(۴۵)

رمضان المبارک سنہ ۱۳۴۵ھ

گزر گیا مہ شعباں مہ صیام آیا — سوادِ قدس سے پیکِ خجستہ گام آیا

ملائکہ کے جنود آسماں سے اُترے — پیامِ رحمتِ باری جہاں کے نام آیا

ہو مژدہ بادہ کشوں کو کہ ایک سال کے بعد — پھر اُن کے سامنے جنّت سے دورِ جام آیا

اِسی مہینہ میں نازل ہُوا کلامِ مجید — اِسی مہینہ میں اسلام کا پیام آیا

ملی سپید و سیہ کو نویدِ امن و سلام — بشر کے واسطے انعامِ لطفِ عام آیا

خنک وہ جان جو اسلام پر نثار ہوئی — خوشا وہ سر جو خدا کی طلب میں کام آیا

خدا کرے کہ میں یہ کہہ سکوں عزیزوں سے
گیا حجاز کو اور فائز المرام آیا

لاہور۔ ۲۷۔ مارچ ۱۹۲۷ء

(۴۶)

انقلاب اے انقلاب

آ رہی ہے باغِ گیتی میں بہارِ انقلاب
کھِل گیا آنکھوں میں رنگِ لالہ زارِ انقلاب

پتی پتی سے صدا طوبیٰ لہم کی ہے بلند
ارغنونِ زندگی ہے شاخسارِ انقلاب

قالبِ مشرق میں پھونکی جا رہی ہے روحِ نو
نغمہ ہائے قُم سے ہے معمور تارِ انقلاب

جانِ استعمار کھینچی جا رہی ہے ہند میں
کس بلا کا روح فرسا ہے فشارِ انقلاب

"انقلابِ تازہ" دیکھو کر رہے ہیں رات دن
پردہ برداری کا دعویٰ پردہ دارِ انقلاب

روزگارِ سفلہ پرور کا تماشا دیکھنا
کاسہ لیسی دے رہی ہے اشتہارِ انقلاب

شہسوارِ آزادیٔ کامل کا اس میں ہے نہاں
بیٹھنے ہی خود دکھا دے گا غبارِ انقلاب

ترکِ جد و جہد ہے تاریکیٔ بزمِ حیات
مشعلِ ہستی میں روشن کر شرارِ انقلاب

انتم الاعلون ہے طغرائے منشورِ قضا
ما استطعتم ہے عنانِ رہوارِ انقلاب

لاہور۔ ۱۵ مئی ۱۹۲۶ء

(۴۷)

سنگٹھن کی چکّی اور شدّھی کی چھلنی

صلاحیں کر رہے ہیں سنگھٹنے بیٹھ کر باہم
کہ بھارت کے سپوت و مالوی جی کے بھگت بنیے

اکھاڑے کھودیئے ڈنٹر پیلئے لٹھ باندھ کر پھریئے
اکڑتے اینٹھتے چلئے بریئے اینڈیئے تنئے

مسلماں گر اٹھائیں سر تو برسا دیجئے اینٹیں
اب اس میں خواہ ہوں اجمیرئیے یا ہوں سہارنئیے

چھٹی کا دودھ یاد آ جائے ان اورنگ زیبوں کو
بتا دیں بھاؤ آٹے دال کا اسلام کے بنئے

یہ چیلے دیویوں کے ہیں کہ رن ہی جیتنا ٹھہرا
تو پرتاپ اور سانگا کی طرح کے سورما بنئے

مسلمانوں سے کہتے ہیں یہ شردھانند کے چیلے
کہ کچھ دن آپ بھی تو تختۂ مشق جفا بنئے

ہی چکّی سنگٹھن کی آسرا شدّھی کی چھلنی کا
جو گیہوں کی طرح پسئے تو آٹے کی طرح چھنئے

لاہور۔ ۶۔ نومبر ۱۹۲۷ء

(۴۸)

سر علی امام!

سروں کے ذکر پہ اک دوست نے سوال کیا
کہ اس گروہ میں کچھ لوگ نیکنام بھی ہیں؟

مری نظر میں تو سب سر ہیں نفس کے محکوم
اور اس کے ساتھ ہی سرکار کے غلام بھی ہیں

دیا جواب یہ میں نے کہ ان کو کچھ نہ کہو
اسی گروہ میں سید علی امام بھی ہیں

مے حجاز نہ پینے کا عہد باندھ کے اب
شکستِ توبہ میں سرگرم اہتمام بھی ہیں

لاہور۔۳۱۔دسمبر ۱۹۲۷ء

۴۹

لالہ لاجپت رائے

ہم ہیں سو جان سے قربان جس آزادی پر
لاجپت رائے بھی تھا اُس کے طلبگاروں میں

رکھی احرار نے اِس مُلک میں جس کی بُنیاد
تھا وہ اُس قصرِ فلک بوس کے معماروں میں

اُس کی تقریر کو بخشی گئی تھی جو تاثیر
ہے کہاں وہ اثر انگریز کے ہتھیاروں میں

بزمِ احرار کی رونق وہ بڑھا دیتا تھا
چاند گویا نظر آتا تھا گھرا تاروں میں

اُس کے مرنے کی جگر پاش خبر آتی ہے
قوم کی قوم ہے آج اُس کے عزاداروں میں

لالہ باقی چمنستاں میں نہیں ہے نہ سہی
داغ تو اُس کا چمکتا ہے چمن زاروں میں

لوگ کہتے ہیں اُسے کُشتۂ تہذیبِ فرنگ
جو پلی ہے ستم و جور کے گہواروں میں

رنگ لائے نہ کہیں خونِ شہیداں اک دن
یہی چرچا ہے ہر اک شہر کے بازاروں میں

لاہور ۔ ۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء

(۵۰)

نوجوانانِ وطن سے خطاب

جکڑے رہو گے کب تک مغرب کے بندھنوں میں
کب تک رہے گی تم پہ غیروں کی حکمرانی

کیوں ہو کے سر بکف تم گھر سے نہیں نکلتے
بچپن سے سُن رہے ہو اسلام کی کہانی

وہ سلطنت ہُوئی کیا ہندوستاں میں جس کی
اورنگ زیب اعظم تھا آخری نشانی

گزرے ہوئے وُہ دن اب واپس نہ آسکیں گے
پھر کیوں نہ یہ نصیحت سُن لو مری زبانی

مل جاؤ ہندوؤں سے اور دونوں مل کے کرلو
اپنے وطن میں قائم ایک ایسی راجدھانی

شیخ اور برہمن کو ایک آنکھ سے جو دیکھے
کرتا ہو عدل جس کا دونوں کی پاسبانی

فرصت جو مل گئی ہے جانو اُسے غنیمت
اور چھوڑو اپنی اپنی دیرینہ قصّہ خوانی

حالی کی روح تم کو پیغام دے رہی ہے
لہرا رہی ہے گنگا کھیتوں کو دے لو پانی

کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

لاہور۔ ۲۹۔ جون ۱۹۲۹ء

(۵۱)

خونِ جگر کی چند بوندیں

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاش جگر گوشۂ بتول

اسلام کے لہو سے تری پیاس بجھ گئی
سیراب کر گیا تجھے خونِ رگِ رسولؐ

کرتی رہے گی پیش شہادت حسینؓ کی
آزادیٔ حیات کا یہ سرمدی اصول

چڑھ جائے کٹ کے سر ترا نیزے کی نوک پر
لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول

تھی داستاں دراز بھی اور دل گداز بھی
لیکن کہاں ہے دل کہ دیا جائے اس کو طول

لاہور۔ ۳۱ مئی ۱۹۳۱ء

(۵۲)

مالابار

۱۹۳۱ء میں مجھے کوچین ۔میسور۔مالابار اور مدراس کے بعض دوسرے خطوں کے دورہ کا اتفاق ہوا۔ یہ نظم اُسی سفر کی یادگار ہے۔

گر عرب کے نقش پا کی شوخیوں کی ہے تلاش
وندھیاچل کو اُلانگ اور نربدا کے پار چل

تا رجیستاں ہیں نخلستان بطحا کا سماں
دیکھنا ہو گر ان آنکھوں سے تو مالابار چل

موپلوں کے منہ سے یہ آوازۂ مستانہ سن
سطوت کبریٰ کی اے باطل فگن تلوار چل

آنکھ میں پھر جائیں تصویریں حنین و بدر کی
پھر اُسی انداز سے ہاں اور بھی اک بار چل

چل بسے ہیں اپنی اپنی چال ابنائے زماں
تو بھی چل بن کر مگر حق کا علم بردار چل

بہ گئیں ارناڈ[1] میں جن کے لہو کی ندیاں
لے کر اُن کے واسطے طوبیٰ لہم کے ہار چل

کوچین ۔ ۹۔ اگست ۱۹۳۱ء

---

[1] مالابار کا تعلقہ ارناد جہاں انگریزی فوج اور موپلا مجاہدین کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی تھی۔

(۵۳)

انقلاب بنگلور

اگست ۱۹۳۱ء میں جب میں نے مدراس کا دورہ کیا اور مدراس سے بنگلور پہنچا تو میرا سیاسی مسلک وہی تھا جو کانگرس کا تھا۔ مولانا شوکت علی کانگرس سے الگ ہو چکے تھے اور کانگرس کی مخالفت بڑی شدت سے کر رہے تھے۔ یہی مخالفت انہیں بنگلور لے گئی جہاں خلافت کے حامیوں کا ایک گروہ اُن کے ایما پہ کانگرس کے رستہ میں ہر طرح کے روڑے اٹکانے پہ تلا ہوا تھا۔ میں جب بنگلور گیا اور مقامی کانگرس کے جلسوں میں تقریریں کیں تو ان جلسوں کو درہم برہم کرنے کے لئے سبھی طرح کے جتن کئے گئے مگر سارے داؤں بیکار گئے۔ بنگلور کے سخن سرا و سخن سنج حضرات نے فرمائش کی کہ حالاتِ حاضرہ پہ کوئی نظم ہونی چاہئے۔ اُن کے ارشاد کا امتثال یوں کیا گیا:-

ہندو کو چھوڑ کر وہ نصاریٰ سے جا ملے — دیکھی جو گول میز تو نیت پھسل گئی

"انگریز کا زوال گوارا نہیں ہمیں" — جو دل کی بات تھی وہ زباں سے نکل گئی

گالی کسی کو دی تو گھما یا کسی پہ لٹھ — خیر الامم سے خوبیٔ علم و عمل گئی

کیوں آ رہے ہیں اُن کی حویلی میں زلزلے — اور کیوں زمین پاؤں تلے سے نکل گئی

تنظیم و اتحاد کا سب کھل گیا فریب   رسی جو اس فریب کی تھی آج جل گئی
حق کے مقابلہ میں نہ باطل ٹھہر سکا   جب اتفاق سے حق و باطل میں چل گئی
ٹوٹا ہے دو ہی دن میں جہالت کا یہ طلسم   ملت اب اور ہی کسی سانچہ میں ڈھل گئی

آیا اک انقلاب یہاں میرے ساتھ ساتھ
بنگلور کے خیال کی دنیا بدل گئی

بنگلور ۔ ۴ ستمبر ۱۹۳۱ء

(۵۴)

قضیّہ مغلپورہ کالج کا تصفیہ

مدراس کی مصروفیات سے فارغ ہو کر جب میں لاہور پہنچا[1] تو یہاں کی سیاسی فضا کو مغلپورہ کالج کے واقعہ سے مکدّر پایا۔ اس کالج کے مسلمان تلامذہ نے اپنے انگریز پرنسپل کی ناقابلِ برداشت بدسلوکیوں سے تنگ آ کر ہڑتال کر رکھی تھی۔ اس گتھی کو سلجھانے میں مجھے اور میرے رفقا کو کئی دن لگے۔ آخر پرنسپل نے ہماری شرائط مان لیں اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ یہ نظم اس واقعہ کی یادگار ہے۔

شرائط ہم نے جتنی پیش کیں حکّام کے آگے ہوئیں تسلیم بے چون و چرا چٹکی بجاتے ہیں

ہوئی دُنیا کی گردن خم ہمارے نام کے آگے کیا وہ کام جب ہم نے خدا خوشنود ہو جس سے

سپر انگریز نے ہندوستاں میں ڈال دی آخر
بصد زاری خدا کے آخری پیغام کے آگے

لاہور
۲۶ ستمبر ۱۹۳۱ء

---

[1] علامہ سیماب اکبرآبادی نے اپنے اخبار "تاج" آگرہ میں ازراہِ بندہ نوازی میری تاریخ مراجعت اپنے اندازِ خاص میں یوں رقم فرمائی:-

بخیر آ گئے لاہور آپ، شکر و سپاس بغیر آپ کے تھی بزمِ اہلِ ذوق اُداس

مراجعت کی یہ تاریخ نذر کرتا ہوں زعیم و جوشِ پنجاب و فاتحِ مدراس

تاج آگرہ ۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۳۱ء ۱۳۵۰ سنہ ہجری

(۵۵)

کوئٹہ کا زلزلہ

قضا سے اب کسی کالے کو شکوہ ہو نہیں سکتا
کہ ہر آفتا دپڑتی ہے اسی قسمت کے ہیٹے پر

گری ہے ناگہاں قہر خدا کی بے پنہ بجلی
نئی تہذیب پر اور اس کے ابیض فام بیٹے پر

مٹا اس مرتبہ سب فرق گورے اور کالے کا
پڑی جب زلزلہ کی آسمانی زد کوئٹے پر

کشمیر کمیٹی

باطل کا جنازہ تھا بڑی دھوم سے نکلا
قائم ہوئی جس دن نئی کشمیر کمیٹی

نابود ہوئے آندلسی اور دمشقی
دونوں نے بساط اپنی نحوست کی لپیٹی

مرزا کی نبوت کے لئے کھودی گئی قبر
گاڑی گئی جس میں یہ خرافات کی بیٹی

حضرت پیر کالون شاہ قدس سرہ العزیز

میں نے یوسف شاہ سے پوچھا کہ بیعت آج کل
آپ کو کشمیر کے پیروں میں کن صاحب سے ہے

ہنس کے بولے قادیاں سے ہو چکا ہوں بدگماں
اس لئے مجھ کو عقیدت کالون صاحب سے ہے

(۵۶)

مہاراجہ ہری سنگھ

فرمانروائے کشمیر سے خطاب

اے جواں سال مہاراجہ کہ بزمِ کشمیر
گو بجتی ہے ترے اخلاق کے افسانوں سے

اے کہ آراستہ ہے نامۂ عظمت تیرا
بخت و دولت کے چمکتے ہوئے عنوانوں سے

ہے یہی میری تمنّا کہ تشکّر کی زباں
نہ کبھی عہدہ برا ہو ترے احسانوں سے

پنجۂ ظلم کو فریاد ترے عدل سے ہو
کہ وہ ہر دور غریبوں کے گریبانوں سے

تُو ہو اُس آہ جہاں سوز کی جیتی تاثیر
جو نکلتی ہے غریبوں کے سیہ خانوں سے

خود رعایا تری حاجب ہو ترے ایواں کی
تاکہ مظلوم ہراساں نہ ہوں دربانوں سے

نہ مسلماں کو برہمن سے رہے کوئی گلہ
نہ برہمن کو شکایت ہو مسلمانوں سے

گر مساجد سے ہو آوازۂ تلطف کا بلند
تو مدارا کا پیام آئے صنم خانوں سے

ہندوؤں سے ہی یقیناً گئے گھر کی رونق   تیری طاقت ہے مگر آج مسلمانوں سے
جن کی دیوانگی سیزدہ صد سالہ کا جوش   داد لینے کو ہے آفاق کے فرزانوں سے
یہ جنوں کیا ہے فقط اُس مئے باقی کا سرور   جو چھلکتی ہے مساوات کے پیمانوں سے
وہ مساوات کہ ہے حاصلِ آزادیٔ فکر   نئی تہذیب نے جو چھین لی انسانوں سے
شرطِ اسلام ہے تسلیم و رضا صلح و سلام   یہ سبق سیکھ لے توحید کے دیوانوں سے
لطف شاہانہ ترا چھین لے گر دل اُن کا   تجھ پہ قربان دلوں سے وہ ہوں اور جانوں سے

یہ وہ سر بیچنے والے ہیں کہ تو اُن کا ہو
تو نہ کچھ بھی تجھے اندیشہ ہو بیگانوں سے

لاہور۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء

(۵۷)

شیخ حسام الدین کی زباں بندی

حکومت کے تدبر کا دوالہ یک بیک نکلا ہوئی کیا عاقبت سنجان دہلی کی خردمندی

کھلے دروازہ آزادی کامل کے دونوں پٹ حسام الدین کو جس دن ملا حکم زباں بندی

تم ان لاکھوں مسلمانوں کو کس طاقت سے روکوگے تمہارا جیل ہو جن کے لئے میرٹھ کی پابندی

ہمارا رشتہ عالمگیر ہے کس کس سے توڑوگے ○ کہیں ہم دہلوی ہیں اور کہیں ہم ہیں سمرقندی

تعلق قطع ہو سکتا نہیں کشمیر کا ہم سے ○ کہ اس خطہ کو بھی اسلام سے نسبت ہے فرزندی

حریفوں کی دراندازی کا ڈر کچھ بھی نہیں ہم کو
ہو "پرتاپ" اس کی علت یا "ملاپ" اور اس کی خورسندی

لاہور - ۸ نومبر ۱۹۳۱ء

(۵۸)

اسلام اور فقط اسلام

عجب انصاف ہی کالے کی تو گردن جھک جائے — لیکن اونچا رہے ہر حال میں سر گورے کا
ہم تو سمجھے تھے کہ یہ خطہ ہی کالوں کا وطن — آپ کہتے ہیں کہ کشمیر ہے گھر گورے کا
سر ہری سنگھ سمجھ لیں کہ اکھڑنا ہی محال — جم گیا آ کے یہاں پاؤں اگر گورے کا
قادیانی جو اڑے پھرتے ہیں ان کا کیا ہی — بال گورے کا رواں گورے کا پر گورے کا
فقط اسلام ہی دنیا میں ہی طاقت ایسی — ناطقہ بند جو کر سکتی ہے ہر گورے کا

اسی اللہ کے بندے کو مسلماں سمجھو
ڈوگرے کا ہو جسے خوف نہ ڈر گورے کا

لاہور - ۱۳ - نومبر ۱۹۳۱ء

۵۹

صوت الحمیر

کان والو انکر الاصوات ہے صوت الحمیر

گر یہ ڈھینچوں ڈھینچوں سننی ہے تو جا قادیاں
عیسیٰ مریم کو گالی قادیاں دے لے مگر
یاد رکھے اُس کی بھی ہیں نانیاں اور دادیاں

تہذیبِ نو کے ابلقی جلوے

ملتِ بیضا کے اُجڑے گھر کی رونق ہو گئیں
اُمتِ پاپا کی تو بر تو ستم ایجادیاں
ضبطیوں پر ضبطیاں ہیں قرقیوں پر قرقیاں
رونقیں تہذیبِ نو کی ہیں یہ مغرب زادیاں
ہونے والی ہے بلند آواز دارو و گیر کی
پھر طرارے بھرنے والی ہے یہ ابلق مادیاں

زادگانِ توحید کی آزادی کا راز

کر دیا خونِ شہادت سے زمیں کو لالہ رنگ
یوں ہی ملتی آئی ہیں اسلام کو آزادیاں

۲ دسمبر ۱۹۳۱ء

(۶۰)

نظام کا فیضِ عام

ابرِ خوش ہنگام اپنے وقت پہ آیا کرے
فصلِ گُل کے ساتھ ساتھ آکر برس جایا کرے

جوئباروں کے کناروں پر بچھا دے فرشِ سبز
ارغواں زاروں میں مروارید برسایا کرے

دامنِ صحرا میں ٹانکے موتیوں کی جھالریں
لالہ و گُل سے خیابانوں کو لہکایا کرے

کوہساروں و بیابانوں پہ برسے جھوم کر
ندیوں کا پاٹ ہر ریلے میں پھیلایا کرے

ابر کا یہ شیوۂ ایثار اچھا ہے مگر
فصل کے جاتے ہی پیاسوں کو نہ ترسایا کرے ○

جستجو دُنیا کو ہے اُس ابرِ دریا بار کی
جو سقامت میں بھی ہر کھیتی پہ لہرایا کرے

اُٹھ کے ہر موسم میں جو مَن برسائے سب پر ایک ساتھ
ابرِ نیساں کو گُہر باری میں شرمایا کرے

اس کے چھینٹوں سے سوادِ قدس[1] اگر سیراب ہے
خاکِ دہلی[2] پر بھی اس کا فیض منڈلایا کرے

---

[1] مسجد اقصیٰ کے لئے ایک لاکھ کا نذرانہ

[2] جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لئے ایک لاکھ

شیخ کے بلے مایہ بٹوے کا اگر رکھے خیال | برہمن کی زر طلب مٹھی بھی گرمایا کرے

آب حیواں سے بھرے ساغر سمرنا[1] کا اگر | ساتھ ہی پونا[2] کی گاگر کو بھی چھلکایا کرے

گر علی گڑھ[3] اس کی فیاضی سے مالامال ہو | سر سے لے کر پاؤں تک کاشی[4] کو بھی نہلایا کرے

شانتی نکتن پہ برسے ہو کے یثرب کی گھٹا | اور مہابھارت[5] سے موتی اپنے رلوایا کرے

رحمتیں اللہ کی شامل ہوں آصف جاہ کو
اور زباں میری گُن اُس کے رات دن گایا کرے

لاہور۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۳۲ء

---

[1] شہدائے سمرنا کے پسماندوں کو ایک لاکھ

[2] بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ پونا کو ایک لاکھ

[3] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو کئی لاکھ

[4] ہندو یونیورسٹی بنارس کو کئی لاکھ

[5] مہابھارت کی شرح کے لئے ایک لاکھ

(۶۱)

بچھڑی ہوئی دلہن کی یاد!

ایک جگر سوختہ شوہر کے قلبی تاثرات

ہاتھ بھی آیا مگر چھن بھی گیا وا حسرتا
گوہرِ نایابِ دریائے عمیقِ زندگی

گھر کی رونق کو لگائے اس نے آکر چار چاند
دید کے قابل تھا اس گھر کا طریقِ زندگی

شمعِ داغِ دل سے روشن ہی شبستانِ فراق
آئی اور زنّاٹہ پا گئی یادِ رفیقِ زندگی

کر دیا ساری تمنّاؤں کو اس نے غرقِ خوں
روز کھلواتا ہوں فصدِ باسلیقِ زندگی

چند ٹکڑے چاند کے باقی ہیں اس کی یادگار
ہے انہی کے دم سے اب لطفِ رحیقِ زندگی

چوکسے (برما)
۲۷۔ نومبر ۱۹۳۳ء

(۶۲)

صبحِ اُمید

کاش باطن کی حقیقت سے بھی واقف ہوتے — جن کے ہاتھ آئی ہے ظاہر کی پرستش کی کلید

جس کا اللہ پر ایمان ہے اُس کو یہ گزند — انہ لیس من اھلک کی سُناتا ہے وعید

نہیں بخشی گئی اُن کو حق و باطل کی تمیز — ایک ہیں اُن کی نگاہوں میں سیہ اور سپید

ان کی نااہل پرستی کی روش ہے یہ قدیم — ان کی مغرب زدگی کا یہ تقاضا ہے جدید

جب غریب الوطنوں کو وہ بُرا کہتے ہیں — گونجتی ہے مرے کانوں میں یہ حافظ کی نوید

صبحِ امید کہ در پردۂ غیب است نہاں
آخر آید ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

میکتیلا (برما)
۲۹۔ نومبر ۱۹۳۳ء

(٦٣)

اقتصاد

ازبسکہ فکر ہے مجھے سب کے مفاد کی
تعلیم دے رہا ہوں میں سب کو جہاد کی

درس اتفاق کا جو دیا شیخ و شاب کو
اُٹھی گلی گلی سے صدا زندہ باد کی

شیخ اور برہمن میں بڑھی صلح و آشتی
برما میں چل رہی ہے ہوا اتحاد کی

بغض و نفاق و کینہ سے سینے ہوئے ہیں پاک
جڑ کاٹنے چلا ہوں میں نخل فساد کی

اب آسماں بھی آنے لگا میری راہ پر
پارینہ داستاں ہوئی اُس کے عناد کی

اسلام کے جلال کا پرچم ہوا بلند
بستی اُلٹ گئی ہے ثمود اور عاد کی

اب بھی چمک رہا ہے حسین علی کا نام
اور خاک اُڑ رہی ہے یزید و زیاد کی

اب بدگمانیوں کا زمانہ نہیں رہا
حاجت ہے ایک دوسرے پر اعتماد کی

محکم بنا اسی سے ہے قصر فرنگ کی
تو بھی کر استوار اساس اقتصاد کی

پیاپوے (برما)
٦ دسمبر ١٩٣٣ء

(۶۴)

دیوبند

شاد باش و شاد زی اے سرزمینِ دیوبند
ہند میں تُو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

ملّتِ بیضا کی عزّت کو لگائے چار چاند
حکمتِ بطحا کی قیمت کو کیا تُو نے دوچند

اسم تیرا بامسمّٰی ضرب تیری بے پناہ
دیوِ استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند

تیری رجعت پر ہزار اقدام ہو جائیں نثار
قرنِ اوّل کی خبر لائی تری اُلٹی زقند

تو علمبردارِ حق ہے حق نگہباں ہے ترا
خیلِ باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند

ناز کر اپنے مقدّر پر کہ تیری خاک کو
کر لیا اُن عالمانِ دینِ قیّم نے پسند

جان کر دیں گے جو ناموسِ پیمبر پر فدا
حق کے رستہ میں کٹا دیں گے جو اپنا بند بند

کُفر ناچا جن کے آگے بارہا تگنی کا ناچ
جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند

اس میں قاسم ہوں کہ انور شاہ کہ محمود الحسن
سب کے دل تھے دردمند اور سب کی فطرت ارجمند

گرمیٔ ہنگامہ تیری ہے حسین احمد سے آج
جن سے ہے پرچم روایاتِ سلف کا سربلند

رنگون
۱۵- اکتوبر ۱۹۳۳ء

(۶۵)

حصارِ قادیاں پر اسلام کا بم

کُفر کا جھنڈا کریں گے آج مرزائی بلند
ہم بھی نکلیں ہاتھ میں لے کر علم اسلام کا

غیب سے کانوں میں پہنچی ہے یہ اُڑتی سی خبر
قادیاں کے سر پہ پھٹنے کو ہے بم اسلام کا

سر چھپائیں گے کدھر جا کر پرستارانِ کُفر
جب عرب اسلام کا ہے اور عجم اسلام کا

گلشنِ رنگون میں فصلِ بہاراں آ گئی
جھوم کر برسا ہے آج ابرِ کرم اسلام کا

دل گواہی دے رہا ہے ایک دن اس دیس میں
بھرنے والے ہیں تمام انسان دم اسلام کا

ایک بر ماہی پہ کیا موقوف ہے سارا جہاں
سر جھکائے گا جب اُٹھے گا قدم اسلام کا

سر کو بیچا اور خریدی اپنے مولا کی رضا
اس تجارت ہی سے قائم ہے بھرم اسلام کا

رنگون۔ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء

(۶۶)

تہذیبِ نو کا بُت خانہ

چڑھا بُت خانۂ تہذیبِ نو پر تمیزِ نسل کا رنگیں چڑھاوا
تو جُھک کر شہسوارانِ عرب نے دیا توحید کے گھوڑے کو کاوا
انہیں میراث دی ہندوستاں کی ہے جاگیران کی برما و رجاوا
تمہیں تثلیث نے سر پر چڑھایا انہیں اسلام دیتا ہے بڑھاوا
دھرا رہ جائے گا سب مغربی ٹھاٹھ کیا جب لشکرِ مشرق نے دھاوا
تمہارے ساز و ساماں کو کسی دن بہا لے جائے گا مکّہ کا لاوا
گِلہ ہم کو ہو کیا ہندو سبھا سے کہ ہے بگڑا ہوا آوے کا آوا

مسلمانو کفن سر سے لپیٹو
کہ آیا ہے محمدؐ کا بُلاوا

رنگون ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء

(۶۷)

بالِ جبریلؑ کی جنبش

خامہ پُر حمد میں جس وقت رواں ہوتا ہے
بالِ جبریل کی جُنبش کا گماں ہوتا ہے

عرش والے اُتر آئے ہیں سلامی کے لئے
کہ بلند آج محمدؐ کا نشاں ہوتا ہے

آپ تکبیر کے نعروں کا اثر کیا جانیں
ان کی اک گونج سے تسخیرِ جہاں ہوتا ہے

آئی برملا کے چمن زار میں یثرب کی بہار
جلوہ اللہ کی قدرت کا عیاں ہوتا ہے

جس نے ناموسِ پیمبرؐ پہ کیا جاں کو نثار
اُس کی عزت کا خدا خود نگراں ہوتا ہے

کہدو جاکر یہ غریبوں سے کہ مایوس نہ ہوں
بے زبانوں کی خُدا آپ زباں ہوتا ہے

قادیاں ہو کہ ہو لاہور بچو دونوں سے
اِس طرف ہوتی ہے ایں اُس طرف آں ہوتا ہے

شعلہ اُٹھتا ہے اگر اس سے الوہیت کا
تو بلند اُس سے نبوت کا دھواں ہوتا ہے

ہیں خدا ان کے نصاریٰ یہ ہیں بندے اُن کے
وہیں ہوتے ہیں یہ انگریز جہاں ہوتا ہے

میرے اشعار پلٹ دیتے ہیں کایا دل کی
اُن میں جب صرف مرا نورِ بیاں ہوتا ہے

رنگین
۲۶۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء

(۶۸)

باواوِلا

ابراہیم اسمٰعیل باوا رنگون کے ایک میمن تاجر ہیں۔ شہر سے کچھ دُور اُن کا ایک نفیس بنگلہ ہے جس کی رونق کو ایک دل کش چمن نے دوبالا کر رکھا ہے۔ اس بنگلہ کا نام "باواوِلا" ہے ایک مرتبہ اُنھوں نے باواولا میں میری دعوت کی۔ دعوت کے بعد قوالی ہوئی۔ بعض سخن سنج احباب نے جن میں برما کے مشہور قومی کارکن یعقوب گوا باوا پیش پیش تھے فرمائش کی کہ باوا وِلا پر کوئی پھڑکتی ہوئی نظم ایسی ہونی چاہئے جو ہارمونیم پر گائی جاسکے۔ میں نے اُسی وقت یہ فرمائش پوری کر دی اور قوال نے ساز کے ساتھ آواز ملا کر اسے اس خوش الحانی سے گایا کہ ساری محفل وجد میں آگئی۔

نشیلی ہے ہوا باوا وِلا کی — رسیلی ہے فضا باوا وِلا کی

جدھر دیکھو اُدھر ہیں پھول ہی پھول — رنگیلی ہے قبا باوا وِلا کی

سُنو گے سبزہ وگُل کی زبانی — کہانی دل ربا باوا وِلا کی

یہ رندوں کا تقاضا ہو کہ ساقی — مئے باقی پلا باوا وِلا کی

نسیمِ خُلد کے آتے ہیں جھونکے — کہ ہو نشو ونما باوا وِلا کی

مجھے پہلے ہی دن سے آرہی ہے — پسند ایک ایک ادا باوا وِلا کی

یہ ہے گلزارِ ابراہیم، رونق

خداوندا بڑھا باوا وِلا کی

رنگون ۲۸۔اکتوبر ۱۹۳۳ء

(۶۹)

زیر بادی

ہندوستان سے جو لاکھوں مسلمان تجارتی کاروبار، سرکاری ملازمت اور محنت مزدوری کے لئے برما میں جا بسے ہیں اُن میں سے اکثر برما کی عورتوں کو حبالۂ عقد میں لے آئے ہیں۔ ان شادیوں سے جو اولاد ہوئی وہ زیر بادی کہلاتی ہے۔ زیر بادیوں کی تعداد برما میں دو لاکھ سے کم نہ ہوگی لیکن مقام افسوس ہے کہ مسلمانانِ برما اپنی اس نسل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اُن کی یہ روش اسلام کی راہ میں سنگِ گراں بنی ہوئی ہے۔ ذیل کی نظم اسی حقیقت کی شرح ہے:۔

گھر مسلمان کے برما کی دُلہن آئے اگر — پھیل سکتا ہی یہاں دین بڑی آسانی سے
لیکن ایسا نہ ہو سُسرال میں حصّہ نہ ملے — اُس کو اسلام کے احساں کی فراوانی سے
میرے اس قول کی تصدیق کریں گے علما — پُوچھ لو جا کے ظفر[۱] احمد عثمانی سے
زیر بادی ہیں ہمارے ہی جگر کے ٹکڑے — ہم نے پالا ہی جنہیں قوتِ ایمانی سے

بڑی مشکل ہے یہ لیکن کہ ہماری اولاد
جوڑتی رشتہ سیاست میں ہی برطانی سے

رنگون
۳۱- اکتوبر ۱۹۳۳ء

[۱] ناظم مدرسہ راندیریہ مغل سٹریٹ رنگون

(۷۰)

نربدا کی لومڑی

کھیل بچوں کا نہیں للکارنا اسلام کو
کوئی بگڑا دل یہ کہہ دے بھائی پرمانند سے

کاسہ سر کا بھی انجام آپ نے سوچا کبھی
آپ ٹکرائے تو ہیں توحید کے فرزند سے

ہیچ پہلا ہی پٹا رن میں کہ ڈھیلی ہو گئی
لالہ کی دھوتی جب الجھی شیخ کے تہ بند سے

لے کے ڈنڈا ہاتھ میں نکلے عطاء اللہ شاہ
کام جب چلتا نظر آیا نہ وعظ و پند سے

ہم مسلماں ہیں کچلتے آئے ہیں باطل کا سر
ڈرنے والے ہم نہیں ہیں ژند و پاژند سے

کیا یہی حب وطن ہے گھول کر لائے وہ زہر
جب مسلمانوں نے کی آن کی تواضع قند سے

بھول جائے گی سب اپنے پینترے ہندو سبھا
پڑ گیا پالا اگر اس کو کسی دھمند سے

دم دبا کر بھاگ نکلی نربدا کی لومڑی
شیر نکلا گونج کر جب وادیٔ ہلمند سے

رنگون ۲۰۔ نومبر ۱۹۳۳ء

(۷۱)

مسلمان رضاکاروں کا ترانہ

اے مسلمان سارا جہاں ہے ترا
یہ زمیں ہے تری آسماں ہے ترا

سب نشانوں سے اونچا نشاں ہی ترا
کبھی یہ بھی کیا ہے خیال تُو نے

تُو نے مشرق میں چھینا ہی راون کا راج
تُو نے مغرب میں لُوٹا ہے قیصر کا تاج

تُو نے سارے جہاں سے لیا ہے خراج
یُوں دکھایا خدا کا جلال تُو نے

تُو نے آکر عرب میں اُجالا کیا
تُو نے شانِ عجم کو دو بالا کیا

بُت پرستوں کو اللہ والا کیا
یُوں بکھیرا نبیؐ کا جمال تُو نے

تُو نے نسل اور مکاں کی اُٹھا دی ہی قید
تُو نے خون اور زباں کی اُٹھا دی ہی قید

سارے اس این وآں کی اُٹھا دی ہی قید
توڑے لاکھوں غلامی کے جال تُو نے

ناؤ خطرہ میں ہے ناخدا بن کے آ
جو نہیں ٹل سکی وہ قضا بن کے آ

ساری دُنیا کا پھر رہنما بن کے آ
اے کہ دیکھا ہے دُنیا کا حال تُو نے

رنگون ۳۔ نومبر ۱۹۳۳ء

(۴۷)

"معصوم"

مسلمان بچوں کے اہتمام میں رنگون سے ایک رسالہ بزبان اردو نکلتا ہے جس کا نام معصوم ہے۔ بچوں کے اساتذہ کی فرمائش پر نظم ذیل سپرد قلم کی گئی۔

پڑ رہی آج ہی رنگون کے ہر گوشہ میں دھوم ۔۔۔ کوئی طبقہ نہ رہا فیض ادب سے محروم

بسکہ اخبار نویسی کے ہیں شائق معصوم ۔۔۔ ہو اسی نام سے اخبار بھی اُن کا موسوم

اس کے ہر لفظ میں مخفی ہیں شریعت کے رموز ۔۔۔ اس کی ہر سطر کا پھیلاؤ ہیں دُنیا کے علوم

اس کا ہر صفحہ یہ لڑکوں کو سبق دیتا ہے ۔۔۔ نہ رہے ہو نہ رہو غیر کے ہو کر محکوم

نہ دبے ہو نہ دبو قوتِ باطل سے کبھی ۔۔۔ یہی اسلام ہو اور یہی اس کا مفہوم

تم کو اللہ نے کونین کی دولت بخشی ۔۔۔ کہ مسلماں کا یہ ہی روزِ ازل سے مقسوم

نام بچوں کی زباں پر جو نبیؐ کا آیا ۔۔۔ تو لیا فرطِ محبت سے خدا نے مُنہ چوم

تربیت گر اسی ماحول میں ان سب کی ہوئی ۔۔۔ اور بڑے ہو کے حقیقت ہوئی حق کی معلوم

تو زمانہ سے مٹا دیں گے یہ باطل کے نشاں

کفر ہو جائے گا یکلخت جہاں سے معدوم

رنگون
۶۔ نومبر ۱۹۳۳ء

(۷۳)

ابراہیمیوں کا گھر

ابراہیم اسمٰعیل باوا صاحب کے بنگلہ "باوا ولا" میں ۲۸ - اکتوبر ۱۹۳۳ء والی دعوت کے بعد اگلے ہفتہ میں متعدد احباب کے ساتھ پھر مدعو ہوا ۔ ذیل کی نظم اس تقریب کی یادگار ہے

اگر رنگون دیکھا ہی اور اس کا آذری فر بھی
تو کھول آنکھ اور کسی دن دیکھ ابراہیم کا گھر بھی

چراغِ کعبہ سے اس کی فضائیں جگمگاتی ہیں
ہیں روشن جب سے اس کے شہ نشیں بھی بام بھی در بھی

خدا کے اور خدا والوں کے رستہ میں لٹانے کو
یہاں مل جائیں گے سیم و طلا بھی لعل و گوہر بھی

یہ پہلے دن سے ابراہیمیوں کو ہے شرف حاصل
کہ بن جاتا ہی سونا گر اٹھا لیتے ہیں پتھر بھی

مسلمانوں کے سر پر کیوں نہ ہو اللہ کا سایہ
کہ ناموسِ محمدؐ پر کٹا دیتے ہیں وہ سر بھی

نہ پوچھو عالم اس رودادِ رنگیں کی درازی کا
نہ ہوگی ختم لکھے جائیں گر دفتر کے دفتر بھی

رنگون ۔ ۷ ۔ نومبر ۱۹۳۳ء

(۷۴)

سیّد کشفی شاہ

کل سُنا تھا نام کشفی شاہ کا
آج دیکھا کام کشفی شاہ کا

بادۂ توحید سے لبریز ہے
کیف پرور جام کشفی شاہ کا

آخری پیغامِ حق اسلام ہے
ہے یہی پیغام کشفی شاہ کا

دعوت و ارشاد کے حلقوں میں ہو
ذکر صبح و شام کشفی شاہ کا

وقف کردی زندگی دیں کے لئے
نیک ہو انجام کشفی شاہ کا

رنگون ۸۔ نومبر ۱۹۳۳ء

(۷۵)

پیام بنام مسلمانانِ میمیو

برما کے سفر کا مجھے دو دفعہ اتفاق ہُوا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۳ئہ میں اور اس کے بعد دوسری بار ۱۹۳۶ئہ میں۔ پہلے سفر میں چند دن رنگون ٹھہر کر مَیں نے شمالی برما کی سیاحت کی اور میمیو۔ مانڈلے۔ کلو اور متعدد دوسرے شہروں کا دورہ کیا۔ میمیو برما کا تابستانی صدر مقام ہے۔ اور ایک نہایت ہی دل فریب نزہت گاہ ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ بیدار، روشن خیال اور ادبِ اردو کا خصوصیت سے دلدادہ ہے۔ میرے چندروزہ قیام میمیو میں شعر و سخن کی محفلیں گرم رہیں اور رخصت ہوتے وقت احباب کی فرمائش پر مَیں نے ذیل کا پیغام مسلمانوں کو دیا:۔

مجھ سے کہ آپ کا ہوں مَیں ادنیٰ ترین غلام
سُن لے پیامِ خواجہ کونین میمیو

خمخانۂ الست ابھی تک ہے جوش میں
پینی ہے گر شراب اسی خمخانہ سے پیو

اسلام ہی وہ رستہ ہے سیدھا کہیں جسے
اس راہ میں مرو اور اسی راہ میں جیو

ہے تار تار ملّتِ بیضا کا پیرہن
اس پیرہن کو سوزنِ ایثار سے سیو

مردوں ہی کے لئے نہیں علم و عمل کی قید
تم پر بھی فرض ہے یہ برابر کا بیبیو

میمیو
۹۔ نومبر ۱۹۳۳ء

(۷۶)

قصرِ استعمار کا مسالہ

بنا جب قصرِ استعمار انگریزوں کا دہلی میں

تو اس میں کام آئیں بن کے چونا ہڈیاں میری

اگر لکھتا ہوں میں کچھ ہاتھ ہوتے ہیں قلم میرے

اگر میں بات کرتا ہوں تو کٹتی ہے زباں میری

نہیں معلوم بھی کچھ ہے میں کس دنیا میں رہتا ہوں

عرب ہے آسماں میرا زمیں ہندوستاں میری

میں استبداد کی بستی کو آگ اک دن لگا دوں گا

مرا نالہ ہے جانسوز آہ ہے آتش فشاں میری

مسلماں ہوں شبابِ جاوداں بخشا گیا مجھ کو

جواں ہے بخت بھی میرا ہے دولت بھی جواں میری

بیمپو
۱۰۔ نومبر ۱۹۳۳ء

(۷۷)

یعقوب گوراباوا

یعقوب گوراباوا کا نام برما میں بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ قومی کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہتے ہیں۔ مبدء فیاض سے انہیں ذوقِ سخن بھی ارزانی ہوا ہے۔ شعر کہتے ہیں اور بلا تکلف کہتے ہیں۔ سفرِ برما میں برابر میرے ساتھ رہے۔ ایک دن مجھ سے نہ برسبیل شکایت بلکہ بطور مزاح پوچھنے لگے کہ حضرت آپ کی بیاض میرے تذکرہ سے کیوں معرّا ہے۔ بیاض نویسی کی خدمت دورانِ سفر میں آپ ہی انجام دیتے تھے میں نے کہا کسی گوشہ میں یہ دو شعر ٹانک لیجئے:۔

نہیں ڈفرن سے ہیں کم مرتبہ گوراباوا
پھر کہیں کیوں نہ انہیں مارکوئیس آف آوا
موم لوہے کو بنا دیتے تھے داؤد اگر
تو ہیں یعقوب بھی اس اپنی صدی کے کاوا

مانڈلے
۲۱۔ نومبر ۱۹۳۳ء

(۷۸)

جواہر لال نہرو اور ہندو مہاسبھا

نہیں ہندوستاں آزاد ہو سکتا قیامت تک — اگر یونہی رہی ہندو سبھا کی فتنہ انگیزی
پرایوں کی درازدستی کا رونا کوئی کیا روئے — جب اپنے کر رہے ہوں آپ اپنی آبرو ریزی
اِدھر ہیں بھائی پرمانند اُدھر ہیں ڈاکٹر مونجے — وہ تلخی ہیں کنائن کی تو یہ ہیں مرچ کی تیزی
غلامی جن کی گھٹی میں پڑی ہو چاہتے کب ہیں — کہ اُٹھے اُن کے سر سے سایۂ تہذیبِ انگریزی
ہے فرق اتنا ہی پرمانند اور چرچل کی فطرت میں — وہ زہریلی یہ قہریلی وہ شبلنگی یہ چنگیزی
بگولا بن کے بولائے پھریں لندن میں بجوڈین — مسلمانوں کی ہو سکتی نہیں اس سے ہوا خیزی
غنیمت ہے کہ آ پہنچی وطن کی لاج رکھنے کو — جواہر لال اور ہندو سبھا کی باہم آویزی

سکھائی ہے ادب کے بادلوں کو میرے خامہ نے
گہر زائی گہر باری گہر خیزی گہر بیزی

چوکسے (برما) ۲۶ - نومبر ۱۹۳۳ء

(۷۹)

زندہ دلانِ میمیو

اے کہ تجھے بہشت کی روئے زمیں پہ ہے تلاش
آ کہ تجھے دکھاؤں میں باغِ جنانِ میمیو

نشئۂ آمدِ نسیم زادۂ بادۂ طہور
جُنبشِ موج سلسبیل آبِ روانِ میمیو

آب و ہوائے میمیو اپنی نظیر آپ ہے
اپنی مثال آپ ہیں خورد و کلانِ میمیو

دیکھ کر اُن کو آنکھ میں خُلقِ رسُول پھر گیا
چھین کے دل کو لے گئے دیدہ ورانِ میمیو

بسکہ مری دُعا شریک اُن کے عمل کے ساتھ تھی
ہوگئے زندۂ ابد زندہ دلانِ میمیو

مانڈلے
۲۷۔ نومبر ۱۹۳۳ء

(۸۰)

از میمیو تا بہ مانڈلے

رستہ ہے یہ میمیو کا پیچ و خم کھاتا ہوا
یا مگر اک سانپ ہے سبزہ میں لہراتا ہوا

چیر کر کہسار کے پہلو کو نکلا آبشار
جس نے دی اس کو روانی اُس کے گُن گاتا ہوا

کاروانِ بوئے گُل دوشِ صبا پہ ہے سوار
گلستانوں کی خیابانوں کو مہکاتا ہوا

وھاں کے کھیتوں کی ہریاول نظر میں بس گئی
سبز پوش اک شاہدِ رعنا ہے، اٹھلاتا ہوا

ماؤں جی نے اپنے گھر میں لا کے ٹھہرایا ہمیں
دل کو دل سے راہ تھی کچھ اُن کا دل جاتا ہوا

رشتۂ دیرینہ تھا تو بندہ میں بھی کام آگیا
تھا یہ سُوت اسلام ہی کے ہاتھ کا کاتا ہوا

جو لوازم تھے اخوّت کے وہ سب پورے ہوئے
حُقّہ بھی آ ہی گیا محفل کو گرماتا ہوا

اک پیالہ چائے کا بھی مل گیا حُقّہ کے ساتھ
زندگی کے لطفِ گوناگوں کو دوہراتا ہوا

ہیمپو سے مانڈلے تک سبزہ و گُل کا ہی فرش
جنّت الفردوس کے نقشہ کو شرماتا ہُوا

ڈیپر گو نم کے نگارہ آرا کلس سے کھیل کر
سُورج آیا دیدۂ باطل کو چُندھیاتا ہُوا

سامنے نظارہ ہے ایراودی کی موج کا
چھین کر دل سے قرار و صبر لے جاتا ہُوا

جانے والوں پر فنا کی چیستاں کو کھول کر
آنے والوں کے لئے دورِ بقا لاتا ہُوا

دامنِ اسلام کی مانند اپنے پاٹ کو
ہر نئے ریلے کی ہر ٹکّر سے پھیلاتا ہُوا

مانڈلے
۲۰۔ نومبر ۱۹۳۳ء



(۸۱)

کلوَ

پہنچا ہیں مجھے اس شان سے کل شام کلوَ میں
تھا سبزہ و گل تا بہ کلو میرے جلو میں

شیرازۂ ملّت کو دیا ربط یہاں بھی
ہر لمحہ ہوا صرف مرا اس تگ و دو میں

یہ جانے کو ہے کفر مثالِ خس و خاشاک
اسلام کے دریائے پُر امواج کی رَو میں

کثرت پہ مسلماں کو کبھی بھی نہ ہوا ناز
اس ایک میں جو بات ہے ہرگز نہیں سَو میں

کافور ہوا چاہتی ہے کفر کی ظلمت
اسلام کے خورشیدِ جہانتاب کی ضَو میں

عبرت کی نگاہوں سے عیاں ہے وہ تغیّر
پنہاں ہے جو اسلام کے ہنگامۂ نَو میں

وہ حلقہ جو تھا زینتِ گوشِ عجم اُس کو
اب دیکھ لو پاپائیوں کے کان کی لَو میں

پیاپوے (برما)
۵۔ دسمبر ۱۹۳۳ء

(۸۲)

تاریخ رحلت

خان بہادر ولی محمد ایم۔ایل سی مرحوم

گھٹ گئی رونق بزم اُس کے گزر جانے سے
اُس کے اُٹھ جانے سے پھیکا ہوا پنجاب کا نور

ماتمی اُس کے پرائے بھی ہیں اپنوں کی طرح
اُس کے غم میں جسے دیکھا نظر آیا رنجور

اُس کے مرنے کے ہیں لوگوں میں گھر گھر چرچے
اپنے کاموں سے وہ برما میں رہے گا مشہور

ہے مسلماں وہی تسلیم ہو جس کا آئیں
آدمی ہے وہی احسان ہو جس کا دستور

سال رحلت میں جب انجام کیا اُس کی تلاش
تو خبر دی مجھے ہاتف نے کہ "ہے وہ مغفور"
۱۳۵۲ھ

پمنا (برما)
۱۰۔دسمبر ۱۹۳۳ء

(۸۳)

بسنت

"پرتاپ" کے بسنت نمبر کے لئے لالہ وزیر چند ایڈیٹر "پرتاپ" کی فرمائش پر

بسنت لے کے پیام بہار آ ہی گیا پیام رحمت پروردگار آ ہی گیا
فضائے غیب سے شیخ اور برہمن کے لئے خدا کے لطف و نوازش کا تار آ ہی گیا
میں اتحاد کا دونوں کو درس دیتا ہوں زباں پہ ہم کے یہ راز آشکار آ ہی گیا
یہ دن بسنت کے بھی کیسے پیارے پیارے ہیں کہ اُن کے غصہ پہ بھی مجھ کو پیار آ ہی گیا

ملی زمانہ سے "پرتاپ" کو مبارکباد
کہ اُس کے ہاتھ مرا شاہکار آ ہی گیا

لاہور۔ ۲۰۔ جنوری ۱۹۳۴ء

(۸۴)

حال مست اور مال مست

گر مست اِدھر حال میں ہیں شیخ مبینا
سرمست اُدھر مال میں ہیں لالہ کشوری

یہ پھر رہے ہیں پیٹ پہ باندھے ہوئے پتھر
توند اُن کی ہے پھولی ہوئی کھا کھا کے کچوری

یہ زردیٔ رُخ کے لئے ہیں فاقہ کے محتاج
سامان اُدھر سرخیٔ لب کا ہے گلوری

دمڑی سے بھی خالی ہے اِدھر شیخ کا کیسہ
آمادہ اُدھر ہُن کے اُگلنے کو تجوری

زندہ رہے کس طرح کہ پلّے نہیں پیسہ
پیسہ کی ضرورت ہے مسلمان کو فوری

تلوار کا بیشک ہے دھنی رائے پتھورا
میداں میں اگر مدِّ مقابل نہ ہو غوری

لاہور - ۲۳ - جنوری ۱۹۳۴ء

(۸۵)

زلزلۂ بہار

غوغائے اذا زلزلت الارض بپا ہے — پوری ہوئی اللہ کی قدرت کی وعید آج

ہے لرزہ براندام ہمالہ کی ترائی — ہے فرشِ زمیں در گروِ بطشِ شدید آج

سُنتے تھے کہ آنے کو ہے اِک روز قیامت — ہے دید کے پردہ پہ ہویدا یہ شنید آج

روتی ہوئی لندن میں نظر آتی ہے مجھ کو — رکھے ہوئے سر خاک پہ تہذیبِ جدید آج

کالوں کو مبارک ہو کہ گوروں کے گھروں میں — بھونچال مساوات کی لایا ہے نوید آج

نازل ہوئی دونوں پہ برابر کی مصیبت — آفت زدہ یکساں ہیں سیہ اور سپید آج

مظلوم کی فریاد سُنی اُس کے خُدا نے — کٹنے کو ستمگار کی ہے حبلِ ورید آج

گر اب بھی لگے درد کی چوٹ اُن کے جگر پر
ہاتھ آئے اُنہیں روضۂ راحت کی کلید آج

لاہور۔ ۲۵ جنوری ۱۹۳۴ء

(۸۶)

کام کی باتیں

گلہ اپنوں سے ہی چلتا ہی ترا جن پر زور
اے مسلمان پرایوں کی شکایات نہ کر

ربِّ کعبہ کے سوا جھک نہ کسی کے آگے
دل سے محو اپنے بزرگوں کی روایات نہ کر

مشکلات اپنی اگر پیش ہی کرنی ہیں تجھے
تو بجز بارگہِ قاضیٔ حاجات نہ کر

علم بے ذوقِ عمل جہل ہی اور وہ بھی بسیط
علم کو در گروِ بندِ خرافات نہ کر

مدرسہ سے نکل اور دیکھ ہے کیا حالِ بہار
بیٹھ کر یاد حریری کے مقامات نہ کر

آسماں سے جو بلا آئی ہے اُٹھ کر اُسے ٹال
آج کل اس کے سوا اور کوئی بات نہ کر

وہ بٹانی ہے ترا ہاتھ تو ہاتھ اُس کا بٹا
کون کہتا ہے حکومت سے موالات نہ کر

لاہور۔ ۲۶۔ جنوری ۱۹۳۴ء

(۸۷)

سہسرام

اوائل فروری ۱۹۳۴ء میں جبکہ میں کلکتہ میں مقیم تھا۔ سہسرام کے کچھ نوجوانوں نے مجھے سہسرام چلنے کی دعوت دی۔ عدیم الفرصتی اس دعوت کی قبولیت کو مانع آئی۔ اور اس کی تلافی ذیل کے پیغام سے کی گئی جو نوجوانانِ سہسرام کے نام تھا۔

ہاں اے نبرد پیشہ جوانانِ سہسرام
سیراب جن کے خوں سے ہے میدانِ سہسرام

تم نے دیا بہار کو پیغامِ نوبہار
تم تھے عنادلِ چمنستانِ سہسرام

دنیا جہاں کے فلسفیوں کے گروہ کو
دیتا تھا درس طفلِ دبستانِ سہسرام

تھیں تم سے برقرار روایاتِ شیر شاہ
اور تم بھی تھے ہنر بہ نیستانِ سہسرام

کیا ہو گئی وہ رونقِ عہدِ قدیم آج
کیوں ہو گئی ہے گوشہ نشیں شانِ سہسرام

کیوں بزم میں نظر نہیں آتے قدح بکف
رندانِ دُرد نوشِ خمستانِ سہسرام

مے بھی وہی ہے خم بھی وہی جام بھی وہی
کس سوچ میں پھر آج ہیں رندانِ سہسرام

اٹھو کرو بلند پھر اسلام کا عَلَم
ہاں اے نبرد پیشہ جوانانِ سہسرام

سارا بہار زلزلہ کی زد میں آ گیا
شامل ہے جس میں کلبۂ احزانِ سہسرام

نظارہ حشر کا ہے نگاہوں کے سامنے
میدانِ رستخیز ہی میدانِ سہسرام

آئی بلا کو ٹال دیں لے کر خدا کا نام
وابستگانِ گوشۂ دامانِ سہسرام

پنجاب اُن کے ساتھ ہی ہمّت سے کام لیں
خوردانِ سہسرام و بزرگانِ سہسرام

یکم فروری ۱۹۳۴ء

(۸۸)

انسان کا پتّھر دل

ہلا دیں زلزلے نے مشرق و مغرب کی بُنیادیں
اُدھر برطانیہ کانپا اِدھر ہندوستاں لرزا

ہر اک کشور کے ہر گوشہ میں ہیبت چھا گئی اس کی
فضائے باختر لرزی سوادِ قیرواں لرزا

گرفت اُس کی جہاں پیما فشار اُس کا جہاں افگن
جہاں کیا چیز ہے کون و مکاں کا ہر رواں لرزا

کرن سورج کی تھرّانے لگی گردونِ گرداں پر
حرم کے کنگروں پر طائروں کا آشیاں لرزا

نئی دُنیا کا سقفِ زرنگار آیا تزلزل میں
نئی تہذیب کے ایواں کا برقی نردباں لرزا

"بہشتی مقبرے" کی ہڈیوں کو بھی ہوئی جنبش
اور اس جنبش کی گیرائی سے سارا قادیاں لرزا

زمین و آسماں لرزے نشانِ حجّتِ حق سے
لرزنا آدمی کے دل کو تھا لیکن کہاں لرزا!

لاہور ۲۰- فروری ۱۹۳۴ء

(۸۹)

بڑے باپ کے بیٹے

(اسلامیہ کالج امرتسر کے طلبہ کی فرمائش پر)

جس باپ کے بیٹے ہو بڑا نام ہے اُس کا — کہلاتے ہو دُنیا میں تم اسلام کے فرزند

گنگا کی طرف بھُولے سے بھی رُخ نہیں کرتے — زمزم کی طرف جاتے ہیں یثرب کے جگربند

خیبر شکنی شیوہ ہے شیرانِ خدا کا — بازو ہیں اسی واسطے اُن سب کے تنومند

ایمان کی دولت ہے اِدھر اور ہے اُدھر کفر — ہے ایک طرف زہر تو ہے ایک طرف قند

وقت آنے لگا ہے کہ ہو اسلام سرفراز — پنجاب میں اوہام کا یہ غلغلہ تا چند

ہر شعر مرا سُقم سے تم پاؤ گے خالی — ریشم میں لگاتا نہیں میں ٹاٹ کا پیوند

اسلامیہ کالج کے تلامیذ کی خاطر — لکھی گئی یہ نظمِ دل آرا زرہِ پند

توحید کے بیٹوں نے جلا رکھی ہے اک "شمع" — اور جمع ہیں گرد اُس کے وہ پروانوں کی مانند

بندہ ہوں محبت کا گواہ اس پہ ہے "سالک" — کافی ہے مرے واسطے ایک اُس کا شکرخند

مرزائیوں سے قطع تعلق ہے مرا دین

امرتسر
۷۔ فروری ۱۹۳۴ء

اس طائفہ سے کام نہیں رکھتے خردمند

(۹۰)

برقِ استعمار

برقِ استعمار پھر چمکی بلوچستان پر
تیغِ استبداد پھر چڑھنے لگی ہے سان پر

ایک سر ہے خم ہو ربِّ کعبہ کے فرمان پر
یا جھکے لندن کے منشورِ قضا جریان پر

جذبۂ بیداری سرحد ہے ایک پیلِ سفید
رہ نہیں سکتا یہ بے زنجیر ہاتھی تھان پر

جھونپڑا نیلام، گھر والی گرو، فصلیں تباہ
کیسی کیسی آفتیں نازل ہوئیں دہقان پر

خانہ جنگی، زلزلے، افلاس، قانونِ فرنگ
ایک سے ہی ایک بھاری آدمی کی جان پر

تم مسلمانوں کو کیا سمجھے ہو وقت آنے تو دو
بچّہ بچّہ سر کٹا دے گا نبیؐ کی آن پر

قید ہو جاتے ہیں سچّی بات کہہ کر دانشگاف
ہم مسلماں ہیں نہ آنے دیں گے آنچ ایمان پر

رشتہ جس نے مجھ سے جوڑا میں بھی اُس کا ہو گیا
دستخط اللہ کے ہیں ثبت اس اعلان پر

آج ہی آساں ہوئی جاتی ہیں ساری مشکلیں
علم والوں کا عمل بھی ہو اگر قرآن پر

ایک دن بامِ ہمالہ پر بھی چمکے گا وہ نُور
جس کے جلوے جگمگاتے تھے کبھی فاران پر

۸۔ فروری ۱۹۳۷ء

(۹۱)

ہنگامۂ کشمیر

ہر طرف ہنگامہ پھر برپا ہے دار و گیر کا
ہو رہا ہے پھر ہرا زخمِ کہن کشمیر کا

گونجتی ہے پھر فضا زنجیر کی جھنکار سے
شور جس میں دب رہا ہے نعرۂ تکبیر کا

ہے خطا اتنی کہ کیوں کرتے ہیں حق اپنا طلب
ہیں یہ ساری سختیاں خمیازہ اس تقصیر کا

بادشہ بے مہر ہے اور بے نیاز اس کا وزیر
شکوہ کس سے کیجئے پھوٹی ہوئی تقدیر کا

ایک لے دے کر خدا باقی ہے جس کے عرش پر
حق ہے کچھ کشمیریوں کے نالۂ شبگیر کا

لاہور

۹ فروری ۱۹۳۲ء

(۹۲)

انقلابِ بلوچستان

مِلّت کو ہو نوید کہ افغان کی طرح
بخشی گئی بلوچ کو بھی زندگی نئی

آیا ہے انقلاب سوادِ قلات میں
یہ موجِ رنگ رنگ اُدھر بھی چلی گئی

عبدالعزیز کُرد پہ ایّوبیوں کو فخر
عبدالصمد کی ذات پہ نازاں اُچک زئی

پھر کر رہے ہیں یادشہوں سے مقابلہ
پتّھر جنھوں نے پیٹ پہ باندھے کٹی کئی

سرحد کے ذرّہ ذرّہ میں ہے رنگِ کربلا
تڑپا نئے سلام سے محفل کو مجرئی

دہقاں کے خونِ گرم کی تاثیر دیکھنا
ہے فروری کی فصل میں بھی جلوہ گرمئی

لاہور۔ ۹۔ فروری ۱۹۳۲ء

(۹۳)

زلزلہ زدگانِ بہار کی دستگیری کا فلسفہ

بشکلِ زلزلہ قہرِ خدا ہوا نازل — کہ کائنات کمر باندھ لے فنا کے لئے
غریب گھُن کو بھی گیہوں کے ساتھ پیس دیا — ہیں ایک ازل سے یہ دونوں آسیا کے لئے
خطا شعار نے خمیازہ جس کا کھینچا ہے — وُہی سزا ہوئی تجویز بے خطا کے لئے
یہ ضابطہ ہے مکافات کا اور اُس کی حدود — نہیں بنائی گئیں فہمِ نارسا کے لئے
ہر ایک شہر میں احباب کو ہے چندہ کی فکر — بلا کشانِ تبہ حال کی بقا کے لئے
کسی نے چندہ دیا تاکہ خوش گورنر ہو — کیا کسی نے یہ ایثار روپسرا کے لئے

سوال یہ ہے کہ کتنے بزرگ ہیں ان میں
کیا یہ کام جنہوں نے فقط خدا کے لئے

لاہور۔ ۱۱۔ فروری ۱۹۳۴ء

(۹۴)

بجے باجے

اخبار "الفضل" قادیان کی اشاعت مورخہ ۱۱۔فروری ۱۹۳۷ء میں ایک تنگ بند شاعر نے "غلام احمد کی جے" کے عنوان سے ذیل کی خرافات شائع کی تھی:۔

دیکھ طغیانیٔ زلازل پے بہ پے اور قیامت خیز منظر پے بہ پے
قوتِ ادراک باقی ہے تو کہہ اُس جری اللہ غلام احمد کی جے

نظمِ ذیل اس خرافات کا جواب ہے:۔

سرورِ کونینؐ کے دربار سے رات آیا قاصدِ فرخندہ پے
حجتِ حق کا سراپا تھا یہ پیک مرحلے سارے کئے تھے جس نے طے
سُن کے ذکرِ قادیاں کہنے لگا یہ خرافاتِ معنعن تا بہ کے
پڑ نہیں سکتی اب اِس طبلہ پہ تھاپ ٹوٹ جانے کو ہے باطل کی یہ نے
اُن گویّوں کے گلے پڑ جائیں گے وجد میں چرچل کو لائی جن کی لے

جب سُنی مَیں نے یہ جاں پرور نوید
مَیں پکار اُٹھا "غلام احمد کی بھے"

لاہور۔۱۵۔فروری ۱۹۳۷ء

(۹۵)

سانگین مل کا عقد

مجھے بھی انتساب ہے ادب کے اُس مقام سے ملی ہوئی ہے جس کی حدِ قدم گہِ نظام سے
دکن کے تاجدار پر خدا کی لاکھ رحمتیں ہماری سب روایتیں ہیں زندہ جس کے نام سے
ہوا غمِ جہاں کا قُفل پڑا ہے میکدہ میں غُل کہ عقدِ سانگین مل بندھا ہے دورِ جام سے
ٹپک رہی ہیں مستیاں شرابِ خانہ ساز کی تتار و ہند و مصر سے عراق و نجد و شام سے
اگر ہے شکوہ رند کو تو ہے تجھی سے ساقیا شکستِ توبہ کو گلہ نہیں ہے اہتمام سے
نبیؐ کی بارگاہ میں صبا یہ جا کے عرض کر کہ سرگراں ہے آسماں حضور کے غلام سے
اگرچہ لغزشیں مری پنہ کی مستحق نہیں نہیں ہوں نا امید میں خدا کے لطفِ عام سے
سُنا ہے برق بن کے پھر گرے گی فرقِ کفر پہ وہ تیغ جو کبھی خجل ہوئی نہیں نیام سے
جہانِ اجتہاد میں سلف کی راہ گُم ہوئی ہے تجھ کو اس کی جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

میں بے نیاز مزد ہوں صلہ کی آرزو نہیں
کسی کو فکر نام کی مجھے غرض ہے کام سے

وہ بھاگتے ہیں اس طرح مباہلہ کے نام سے
فرارِ کفر جس طرح ہو مسجد الحرام سے

پکار کر یہ کہہ رہا ہے زلزلہ بہار کا
نہ بچ سکے گا قادیاں خدا کے انتقام سے

مسیلمہ کے جانشیں گرہ کٹوں سے کم نہیں
کتر کے جیب لے گئے پیمبری کے نام سے

سنا بھی تو نے ہم نفس کہ قادیاں دمشق کی
ہوئی ہی جفت اندلس کے خنگ بدلگام سے

پچی پچی کے دوش پر سر نگیں میں اٹھ گیا
جناب "ٹل مسیح" کا جنازہ دھوم دھام سے

میں قادیاں سے کیا لڑوں کہ فرصت آج کل نہیں
رکوع سے سجود سے قعود سے قیام سے

لاہور - ۲۱ - فروری ۱۹۳۴ء

(۹۶)

روٹی روٹی روٹی!

ہاتھ میں لے کر سرخ نشان　　　بچے بڈھے اور جوان

کرتے پھرتے ہیں اعلان　　　پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

آ پہنچے بھئی آ پہنچے —————— پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

خون جگر کا کھانے والے　　　فاقوں سے مر جانے والے

یہ بھی ایک ان کی پہچان　　　پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

آ پہنچے بھئی آ پہنچے —————— پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

سارے کے سارے ہیں بیکار　　　روٹی روٹی کی ہے پکار

پڑ گیا خطرے میں ایمان　　　پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

آ پہنچے بھئی آ پہنچے —————— پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

کوئی ہے ان میں بی اے پاس　　کوئی ہے ان میں پنڈی داس
کوئی ہے ان میں ایم اے خان　　پیٹ کے بھوکے آ پہنچے
آ پہنچے بھئی آ پہنچے ——— پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

کب تک بیٹھے صبر کریں　　اپنی جان پہ جبر کریں
آخر یہ بھی ہیں انسان　　پیٹ کے بھوکے آ پہنچے
آ پہنچے بھئی آ پہنچے ——— پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

آ پہنچا لاہور میں رُوس　　شملہ کی چھاتی کا کابُوس
ہیں یہی لینن کے دربان　　پیٹ کے بھوکے آ پہنچے
آ پہنچے بھئی آ پہنچے ——— پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

بھاؤ ہوا ہے بھوک کا تیز　　سوچ رہے ہیں کیا انگریز
کیا اُنہیں ہوں گے اب بھی نہ کان　　پیٹ کے بھوکے آ پہنچے
آ پہنچے بھئی آ پہنچے ——— پیٹ کے بھوکے آ پہنچے

لاہور
۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء

(٩٧)

کفن چوروں کے دروازہ پر اقبالؒ کی دستک

لحمِ خنزیر بھی جائز ہے بحکمِ قرآں
جاں بلب ہوں اگر اسلام کے بھوکے فرزند

عربی فلسفہ کا صاد ہے اس فتوے پر
غیر بارغ کا لگا ہو اگر اُس میں پیوند

یہی حکمت ہے کہ دیں کُفر کے گھر جاتا ہے
گردنِ عجز میں ڈالے ہوئے ذلّت کی کمند

یہی موجب ہے کہ فریاد کی ساری راہیں
جب ہوئیں دہلی و لندن کے مضافات میں بند

تو گئے برق کے کاندھے پہ جنیوا اقبال
کہ ہو کشمیر کی بیداد کی آواز بلند

جانِ مضطر کے لئے تھا یہ تذلّل منظور
جس کو برداشت کرے گا نہ کوئی غیرتمند

ورنہ اقبال کہاں اور یہ تگ و دو کیسی
نہیں ہرگز جو اس اللہ کے بندے کو پسند

یہ تگ و دو تو ہے اُن کے لئے جن کا مسلک
ہے وہی جس کے لئے وقف ہوئے پسماند

خود وہ کہتا ہے کہ یہ مجلسِ اقوام ہے کیا
مَن ازیں بیش نہ دانم کہ کفن دزدے چند

"بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند"

لاہور۔ ۷۔ مارچ ۱۹۳۲ء

(۹۸)

اطالوی حسینہ

اے کشورِ اطالیہ کے باغ کی بہار
لاہور کا دمن ہے ترے فیض سے چمن

پیغمبرِ جمال تری دل رُبا ادا
پروردگارِ عشق ترا چلبلا چلن

اُلجھے ہوئے ہیں دل تری زلفِ سیاہ میں
ہیں جس کے ایک تار سے وابستہ سو ختن

پروردۂ فسوں ہے تری آنکھ کا خمار
آوردۂ جنوں ہے تری بُوئے پیرہن

پیمانۂ نشاط تری ساقِ صندلی
بیجانۂ سرور ترا مرمری بدن

رونق یہی ہوٹلوں کی ترا حسن بے حجاب
جس پہ فدا ہے شیخ تو لٹتو ہے برہمن

جب قادیاں پہ تیری نشیلی نظر پڑی
سب نشۂ نبوتِ ظلّی ہوا ہرن

میں بھی ہوں تیری چشمِ پُرافسوں کا معترف
جادو وہی ہے آج جو ہو قادیاں شکن

لاہور - ۸ - مارچ ۱۹۳۴ء

(۹۹)

ذوقِ ادب

شریعت کے نگہباں پا بجولاں ہوتے جاتے ہیں
مسلمانوں کی آزادی کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

پرستارانِ خاکِ کعبہ بے تابانہ بڑھ بڑھ کر
رسول اللہ کی عزّت پہ قرباں ہوتے جاتے ہیں

شہیدانِ وطن کے خون کے عناب گوں چھینٹے
ہماری داستاں کا زیبِ عنواں ہوتے جاتے ہیں

ہوا ہی چاہتا ہے پاک استبداد کا قصّہ
کہ چاک اپنے گریباں تا بہ داماں ہوتے جاتے ہیں

طلسمِ قیصریت توڑنے والے نکل آئے
ستم کیشانِ عالم خس بدنداں ہوتے جاتے ہیں

نکلتا جا رہا ہے خوفِ غیر اللہ کا دل سے
حرم کے تاکنے والے ہراساں ہوتے جاتے ہیں

پڑی ہے کھلبلی مغرب میں یہ ہرتی خبر سُن کر
کہ مشرق کے مسلماں پھر مسلماں ہوتے جاتے ہیں

بلیٰ کہہ کر جسے کشمیر کی مٹی نے باندھا تھا
خدا سے اُستوار اب پھر وہ پیماں ہوتے جاتے ہیں

بلوچ اس وقت اگر ہیں قید کل آزاد بھی ہوں گے
ہوا کیا اُن سے گر آباد زنداں ہوتے جاتے ہیں

نہیں تخصیصِ عہد اس میں محمدؐ کے غلام اب بھی
سکندر بنتے جاتے ہیں سلیماں ہوتے جاتے ہیں

ادب کا ذوق ہے جن کو مرے اشعار سُن کر
سخنور بنتے جاتے ہیں سخنداں ہوتے جاتے ہیں

لاہور۔۱۰۔مارچ ۱۹۳۴ء

(۱۰۰)

چونڈہ

انجمن تبلیغ الاسلام چونڈہ ضلع سیالکوٹ کے سالانہ جلسہ کی تقریب پر

کیا ہے ابر نے گلیوں میں پا بگل ہم کو
بہار دیکھنے آئے تھے ہم چونڈہ کی

بٹھائے جائیں گے جلسہ میں خاکسار کہاں
زمین جب کئی دن سے ہو نم چونڈہ کی

اگر رہا یہی یاروں کا شیوۂ ایثار[1]
تو رونقیں نہ کبھی ہوں گی کم چونڈہ کی

نہ آئیں گے یہی نظر آئیں گے نہ مرزائی
اگر علَم ہوئی تیغ دو دم چونڈہ کی

یہاں کا تحفہ سوا اس کے اور کیا ہوگا
میں ساتھ لے کے چلا ہوں حلیم چونڈہ کی

علی الصباح ملی مجھ کو قادیاں والی[2]
فضائیں ہو گئیں رشک ارم چونڈہ کی

خدا کرے کہ بجز اُس کی آستاں کے کبھی
کسی کے آگے نہ گردن ہو خم چونڈہ کی

چونڈہ ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء

۱؎ حاجی سر رحیم بخش جنہوں نے میری ایک نعت سے متاثر ہو کر انجمن تبلیغ الاسلام چونڈہ کو دو سو روپے دئے ۲؎ چونڈہ سے دو میل پر ایک گاؤں کا نام۔

(۱۰۱)

اطالوی حسینہ مس روفو

تمہیں مشئ فی النوم کی بھی خبر ہے
زمانہ کے اے بے خبر فیلسوفو

ملے گا تمہیں یہ سبق قادیاں سے
جہاں چل کے سوتے ہیں آئی ہیں روفو

دبستاں میں جانا نہیں چاہتے ہو
تو پہنچو شبستاں میں اے بے وقوفو

بہار آ رہی ہے خزاں جا رہی ہے
ہنسو کھلکھلا کر دمشقی شگوفو

کرشن اور خورسند کیا اس کو سمجھیں
تمہیں داد دو اس کی عبدالرؤفو

جب اوقات موجود ہے قادیاں کی
کہاں مر رہی ہو تفو اور زدفو

لاہور - ۱۳ - مارچ ۱۹۳۴ء

(۱۰۲)

ہوٹل سسل کی رونق عریاں

عشاق شہر کا ہے "زمیندار" سے سوال
ہوٹل سسل کی رونق عریاں کہاں گئی

اُس کے جلو میں جاں گئی ایماں کے ساتھ ساتھ
کیا کیا نہ تھا جو لے کے وہ جانِ جہاں گئی

خوفِ خدائے پاک دلوں سے نکل گیا
آنکھوں سے شرمِ سرورِ کون و مکاں گئی

بن کر خروشِ حلقۂ رندانِ لم یزل
لے کر گئی وہ حشر کا ساماں جہاں گئی

روما سے ڈھل کے برق کے سانچے میں آئی تھی
اب کس حریمِ ناز میں وہ جانِ جاں گئی

یہ چیستاں سُنی تو "زمیندار" نے کہا
اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ قادیاں گئی

لاہور
۱۵۔ مارچ ۱۹۳۴ء

(۱۰۳)

فریاد اور اُس کا اثر

جو ہو نہ سکا تھا کسی تقریر سے پیدا
وہ جوش ہُوا نعرۂ تکبیر سے پیدا

فریاد اثر سے کبھی خالی نہ رہے گی
ہوگا یہ اثر نالۂ شب گیر سے پیدا

بُنیاد ہلا دینے کو ہے قصرِ جفا کی
وہ شور جو زنداں میں ہے زنجیر سے پیدا

کشمیر میں اسلام کا ہر عقدہ ہُوا ہے
برطانیہ کی زلفِ گرہ گیر سے پیدا

سُن لوگے کسی دن یہ شہیدوں کی زباں سے
آزادیٔ دہلی ہوئی کشمیر سے پیدا

تلوار پہ قبضہ خلفا ہی کا نہیں تھا
پاپا بھی ہوئے ہیں دمِ شمشیر سے پیدا

کہہ دے کوئی اُن سے کہ مَیں ہوں زادۂ توحید
"تقدیر ہُوئی ہے مری تدبیر سے پیدا

دل پر اُتر آئے ہیں کبھی مٹ نہ سکیں گے
جو نقش ہوئے ہیں مری تحریر سے پیدا

لاہور - ۱۵ - مارچ ۱۹۳۴ء

ڈاکٹر سیف الدّین کچلو

وطن کا خونِ ناحق جب بہایا مارشل لا نے
تو سُرخی اُس لہو کی بن گئی عنوانِ امرت سر

پکڑ کر لے گئے زنداں میں سیف الدّین کچلو کو
فرنگستان کی مُٹھّی میں آئی جانِ امرت سر

اُسے اُس کے خُدا نے فطرتِ آزاد بخشی ہے
دو بالا ہو گئی جس کی بدولت شانِ امرت سر

سُنا ہے جب اسیری سے رہا ہو کر وہ آئے گا
کریں گے دیدہ و دل فرشِ راہ اعیانِ امرت سر

جو اُس کی آمد آمد کو گُل افشانی کی حاجت ہو
تو خالی لالہ و گُل سے نہیں دامانِ امرت سر

اگر کرنا ہے استقبال اس آزادی کے پُتلے کا
تو اپنا فرض پہچانیں مسلمانانِ امرت سر

پھر ارزاں نرخ ہو جانے کو ہے اب سرفروشی کا
چمک جانے کو پھر کچھ دن میں ہے دُکانِ امرت سر

یہ دعوے سرفروشانِ وطن کا کس قدر سچ ہے
نہیں مارا گیا اس وقت تک میدانِ امرت سر

مسلمانوں کے کس بل میں نہ فرق آیا نہ آئے گا
سلامت حشر تک یا رب رہے ایمانِ امرت سر

کرشمہ اس کو میرے خامۂ گُل ریز کا سمجھو
ہے خارستانِ امرتسر بہارستانِ امرت سر

مری اس نظم کو فرمائشی ہرگز نہ کہئے گا
یہ فرمائش نہیں تھی بلکہ تھا فرمانِ امرت سر

۱۶۔ مارچ ۱۹۳۷ء

(۱۰۵)

عبیداللہ خاں

حکومت سے تقاضا ہی وطن کا — رہا کر دو عبیداللہ خاں کو
یہی خواہش ہے شیخ و برہمن کی — یہی منظور ہے ہندوستاں کو
اگر خوفِ خدا کچھ بھی ہے دل میں — تو چھوڑو اس اسیرِ نیم جاں کو
توانائی حکومت کی مسلّم — کچل سکتی ہے جو ہر ناتواں کو
وہ استبداد کی سوزن سے بیشک — پلوں میں چھید سکتی ہے زباں کو
جلال اس کا مگر روکے گا کس طرح — کسی بیکس کے شورِ الاماں کو
وہ دل کے کان کھولے اور سن لے — "یہ قدرت ضعف میں بھی ہے فغاں کو
"کہ دے پٹکے زمیں پہ آسماں کو"

لاہور ۔ ۱۷ ۔ مارچ ۱۹۳۴ء

(۱۰۶)

حسنِ آبادِ بیاس!

آئی ہیں جب سے موٹریں رسمِ حجاب اُٹھ گئی — اب نہ وہ پردہ والیاں اور نہ وہ اُن کی ڈولیاں

شرع کی قید ہے کدھر آنکھ کی شرم ہے کہاں — بول رہی ہیں بلبلیں کن چمنوں کی بولیاں

رنگ ہے بو نہیں مگر گلکدۂ فرنگ میں — جن سے ہماری مالنیں لائی ہیں بھر کے جھولیاں

جلوہ گہِ بیاس کو لگ گئے چار چاند — بھیج رہا ہے قادیاں ماہ وشوں کی ٹولیاں

دل زدگانِ بے بصر جن سے لگا رہے ہیں دل — حور کی بچیاں نہیں سانپ کی ہیں سنپولیاں

آپ کو کچھ خبر بھی ہے کون ہیں یہ گورنسیں — دیکھنے کو ہیں رس بھری چکھنے میں ہیں نبولیاں

اُن کو بھی منہ بسور کر آج یہ ماننا پڑا

ہیں یہ اطالوی مسیں زہر کی میٹھی گولیاں

لاہور - ۱۸ - مارچ ۱۹۳۴ء

(١٠٧)

خواجہ حسن نظامی!

صوفی بھی ہیں رئیس بھی ہیں اور ملنگ بھی
اور جانتے ہیں خواجہ تجارت کے ڈھنگ بھی

سرگرمیاں سب اُن کی ہیں مذہب کے نام پر
جن میں کہیں کہیں ہو سیاست کا رنگ بھی

وہ کامیاب اگر ہیں تو اس کا یہ بھید ہے
دُنیا کے ساتھ اُڑاتے ہیں دیں کا پتنگ بھی

دل بستگی ہے گر اُنہیں سازِ حجاز سے
بجتا ہی اُن کے گھر میں طریقت کا چنگ بھی

ہوتے اُدھر ہیں رین بسیرا میں چلہ کش
رکھتے اِدھر ہیں رن میں غزا کی اُمنگ بھی

کرتے ہیں میٹھی باتوں سے پتھر دلوں کو موم
کافر کے گھر لگاتے ہیں جا کر سُرنگ بھی

حُلیہ رقم کیا تو پکاری سلوچنا
ترکش میں خواجہ کے ہیں ادب کے خدنگ بھی

ہندوستان مان لے اپنا امام اُنہیں
گر چند روز کاٹ لیں قیدِ فرنگ بھی

لاہور۔ ۱۹۔ مارچ ۱۹۳۲ء

(۱۰۸)

"شیطانی" حکومت کے ساتھ

گاندھی جی کا مؤدبانہ تعاون

پرستارانِ آزادی کا قصہ — نہیں تُو نے سُنا اب تک تو اب سُن

ادب کا بھاؤ سستا ہو رہا ہے — حکومت کے گنے جانے لگے گُن

کٹی اک عمر جس کو کوستے ہیں — اُسی "شیطاں" کے ساتھ اب ہے تعاون

سمجھتے تھے جسے گاندھی مہاپاپ — اُسی کو آج کہتے ہیں مہاپُن

یہ فرماتا ہے گاندھی جی کا چرخہ — وفاداری کا کھدر آج سے بُن

سُنی سابرمتی کی راگ مالا — تو کاشی نے بھی جھٹ چھیڑی نئی دُھن

سُنی تھی کس نے ان سازنگیوں کی — یہ رُوں وُں ٹُن ٹُن پیں پیں پیں تن تن

مقدر کا پلٹنا دیکھتا جا — کہا اللہ کی قدرت نے جب کُن

محاً اسلام کے دانتوں کے تنکے | بصد تعظیم گاندھی نے لئے چُن
کیا کرتی تھی جس پر کانگرس ناز | ہُوا کیا اُس تدبّر کا توازن
کہاں ہے آج اُس کا وہ تفاخر | کدھر ہے آج اُس کا وہ تراعن
کہا جاتا انہیں دُشمن وطن کا | دکھاتے گر مسلماں یہ تلوّن

مگر جو کچھ کریں گاندھی روا ہے
کہ ہر فعل آپ کا فعلِ خدا ہے

لاہور
۲۱۔ مارچ ۱۹۳۴ء



(۱۰۹)

مجاہدینِ بلوچستان

مردانِ مجاہد ہیں گردانِ بلوچستان
دبتے نہیں باطل سے شیرانِ بلوچستان

جس وقت سے قاسمؒ نے گاڑا ہی یہاں جھنڈا
لغزش میں نہیں آیا ایمانِ بلوچستان

کیا لائیں گے خاطر میں خم خانۂ لندن کو
مستِ مئے یثرب ہیں رندانِ بلوچستان

خونِ رگِ بطحا سے پہنچا جو یہاں بہہ کر
گُلرنگ ابھی تک ہیں میدانِ بلوچستان

ہیں اُس کے زعیموں میں کُردا ور اچک زائی
وہ شانِ بلوچستان یہ آنِ بلوچستان

آزادیٔ کامل پر حق ہے بدویت کا
اور یہ بدویت ہے سامانِ بلوچستان

وہ وقت بھی آتا ہے دیکھو گے ان آنکھوں سے
دارا و سکندر کو دربانِ بلوچستان

اسلام کی عزت پر سو جان سے قرباں ہے
ملّت کو نہ بھولے گا احسانِ بلوچستان

ہے ذوقِ سخن جن کو سُن کر اسے کہہ دیں گے
یہ نظم مرصّع تھی شایانِ بلوچستان!

لاہور، ۲۲۔ مارچ ۱۹۳۲ء

(۱۱۰)

روزنامۂ "آزاد"

بیٹے کو روا ہے کہ پھرے در بدر آزاد
یارب نہ روا رکھ کہ ہو مادر پدر آزاد

ہم نے تو اُسے پابگل اوّل ہی سے دیکھا
کیوں سرو کو لکھتے ہیں حقیقت نگر آزاد

ہر فقرہ کی ہر سطر ہے اغراض کی پابند
مکتوب گرامی کا ہے عنوان مگر "آزاد"

تم نے کبھی اس نکتہ پہ بھی غور کیا ہے
آتا نہیں بازار میں کیوں اب نظر "آزاد"

اغیار بھی کہتے ہیں کہ ہوتا نہ کبھی ختم
دیتا نہ "زمیندار" کو دھوکا اگر "آزاد"

حق کی اُسے تائید ہو کس طرح میسّر
جب حق کے حریفوں سے ہو شیر و شکر آزاد

دیتا ہے خدا اجر اُسی مردِ خدا کو
سودائے زر و سیم سے جس کا ہے سر آزاد

"تلوار حکومت کی لٹکتی رہی سر پر"
اس پر بھی "زمیندار" رہا عمر بھر آزاد

پچیس برس کم نہیں ہوتے مگر ان میں
ہم نے اسے دیکھا ہی اُدھر قید اِدھر آزاد

اس نام کے اخبار کا چلنا نہیں آساں
رکھے نہ کبھی نام کوئی بھول کر "آزاد"

لاہور - ۲۲ - مارچ ۱۹۳۷ء

(١١١)

سازِ حجاز

میری جبیں کی سجدہ گاہ کفر کا آستانہ نہ ہو
تیرے نیاز مند کا حشر یہ اے خدا نہ ہو

تُو نہ سُنے تو اَور کون میری پُکار کو سُنے
جا کے پناہ لُوں کہاں تُو ہی اگر مرا نہ ہو

شامل حال ہو اگر فضل ترا تو شوق سے
برسرِ جنگ ہو زمیں برسرِ کیں زمانہ ہو

وضع کا پاس ہی رہے جبر کی بارگہ میں بھی
فرق نہ آئے آن میں اور وہ موحدانہ ہو

غیر کے سامنے کروں دستِ سوال کیوں دراز
میرے لئے کھلا ہوا غیب کا جیب خزانہ ہو

جا کے میں اُس جگہ رہوں سانس میں اُس فضا میں لُوں
دینِ قویم کا عَلَم جس میں جُھکا ہُوا نہ ہو

عید کا جشن ہو بپا شرطِ نشاط ہے یہی
سازِ حجاز کا چھڑے اور یہ مرا ترانہ ہو

لاہور - ۲۲ - مارچ ۱۹۳۴ء

(۱۱۲)

مردِ مومن کی سرشت

اگر چندہ کی حاجت ہے تو کر دعویٰ رسالت کا
بغیر اس ڈھونگ کے چندہ مہیا ہو نہیں سکتا

سُنا ہے قادیاں میں بانسری بجتی ہے گوکل کی
مگر ہر بانسری والا کنہیا ہو نہیں سکتا

یہ آساں ہے کہ بدلے جُون اور بچھو بنے لیکن
کبھی بھی شہد کی مکھی ततیا ہو نہیں سکتا

مجدد الفِ ثانی سے غلام احمد کو کیا نسبت
ثری کتنا بھی اونچا ہو ثریا ہو نہیں سکتا

اگر مکہ سے بھی کرتا وہ ڈھینچوں ڈھینچوں ہو آئے
یہ ظاہر ہے خرِ عیسیٰ گویا حاجی ہو نہیں سکتا

برادرخواندگی کی شرط اگر ہو میرزائیت
قیامت تک بھی ہم سے تو یہ بھیا ہو نہیں سکتا

سرشت مردِ مومن کا بدلنا غیر ممکن ہے
چنبیلی کا یہ پودا بھٹ کٹیا ہو نہیں سکتا

وطن کے پوجنے والو تعلّق نوعِ انساں کا
محبت کا سمندر ہے تلیا ہو نہیں سکتا

○ جسے اسلام کی حُرمت پہ کٹ مرنا نہ آتا ہو
مسلمانوں کے بیڑے کا کھویا ہو نہیں سکتا

لاہور - ۲۷ - مارچ ۱۹۳۴ء

(۱۳۱)

وادیٔ جہلم

گاتے ہوئے یہ نغمہ دو میلی سے چلے ہم　　اسلام سے ہے گرمیٔ ہنگامۂ عالم
ہرگز نہ جھکے گا کبھی توحید کا پرچم　　گا تو بھی یہی زمزمہ اور ہو یہی سرگم

اے وادیٔ جہلم

میداں ترے شاداب سمن بو ترے ٹیلے　　چشمے ترے شفاف چمن تیرے رنگیلے
کھیتی تری سرسبز ثمر تیرے رسیلے　　رونق ترے باغوں کی خزاں کر نہ سکی کم

اے وادیٔ جہلم

انساں ہیں تہمتن تو سرشت اُن کی وفا خیز　　توسن ہیں اگر تیز تو ہمت اُن کی ہے مہمیز
قابض تری اس صولت و سطوت پہ ہیں انگریز　　یہ صولت و سطوت ہے تو انگریز کو کیا غم

اے وادیٔ جہلم

یونان کے ہنگامہ کو غزنی کے شغب کو　　محمود کے غصّہ کو سکندر کے غضب کو
موجیں تری ندی کی بہا لے گئیں سب کو　　اب کس کی تباہی کے ارادے ہیں مصمم

لاہور ۳۰- مارچ ۱۹۳۷ء　　اے وادیٔ جہلم

(۱۱۴)

دعوت وارشاد

ہاتھ استعمار کا شل ہو رہا ہے ہر طرف
ساری دُنیا کے غلام آزاد ہو جانے لگے

دھجیاں تہذیبِ مغرب کی فضا میں اُڑ چلیں
یہ قبا لے زائد المیعاد ہو جانے لگے

زیر دستوں نے اُدھر فریاد کی اللہ سے
زیر دست آزار اِدھر برباد ہو جانے لگے

کوئی دن جاتا ہے دے گا یہ خبر خود بالفور
پھر فلسطیں میں عرب آباد ہو جانے لگے

دینِ قیّم بن گیا بازیچۂ اہلِ ہوا
سو بسو مذہب نئے ایجاد ہو جانے لگے

منکرِ ختمِ نبوّت ہو کے اہلِ قادیاں
اپنے وقتوں کے ثمود و عاد ہو جانے لگے

کالجوں میں پڑھ کے انگریزی ہمارے نوجواں
رفتہ رفتہ مائلِ الحاد ہو جانے لگے

شرع کی جب کوئی بھی مشکل نہ کر سکتا ہو حل
کیوں خفا شاگرد سے اُستاد ہو جانے لگے

کاش میں سُن لوں کہ علمِ دیں کے حلقے جابجا
حلقہ ہائے دعوت وارشاد ہو جانے لگے

لاہور
۵- اپریل ۱۹۳۶ء

(۱۱۵)

الکاسب حبیب اللہ

سرمایہ نے محنت سے یہ کہا اس شور و شغب سے کان نہ دھر
تو کچھ بھی کرے ہونا ہے وہی جو ہم نے جی میں بچارا ہے
طوفاں کے تھپیڑے ایک طرف موجوں کے تھپیڑے ایک طرف
منجدھار میں پڑ گئی ناؤ تری اور کوسوں دور کنارا ہے
تیرے لئے ہی خونِ نابِ جگر اور میرے لئے ہے نغمۂ تر
تقدیر کی انگلی اٹھ اٹھ کر کرتی یہی روز اشارا ہے
جس مٹی والی حویلی میں بسنے کی مجھے توفیق ملی
ہڈی تری اس کا چونا ہے تیرا لہو اس کا گارا ہے
جو سوکھے ٹکڑے میں تجھے دوں کھا کر انہیں سوقمست کو نہ رو
نیوہڑا مرے آگے گردن کو اور اس کے سوا کیا چارا ہے

سرمایہ نے یُوں جب ڈون کی لی محنت نے چمک کر اُس سے کہا

اس وقت تو بیشک گردش میں ہم فاقہ کشوں کا ستارا ہے

لیکن تجھے اس کی بھی ہے خبر تُو نے نہ سُنا اب تک ہو تو سُن

تقدیر پلٹتی رہتی ہے تقدیر کا رنگ نیارا ہے

جس ڈھلتی پھرتی چھاؤں کو تو اپنا ہی اجارا سمجھا ہے

آج اس پہ اگر قبضہ ہے ترا کل دعویٰ اس پہ ہمارا ہے

اسلام نے جب یہ بحث سُنی سرمایہ کو ڈانٹا اور کہا

اُلٹے گا وہ اک دن ٹاٹ ترا مزدور خدا کا پیارا ہے

لاہور

۷۔اپریل ۱۹۳۷ء

(۱۱۶)

گاندھی جی کی پسلی

کیا پٹنہ سے انصاری نے اعلان ... کہ غائب ہوگئی گاندھی کی پسلی
نظر کا انتخاب اُن کو مبارک ... اُسی کی آج سے پھڑکے گی پسلی

کونسلوں کے پجاری

گھٹا اب کانگرس کی چھٹ رہی ہو ... اسے جتنا برسنا تھا برس لی
ہُوا منظور جب قرطاسِ ابیض ... تو لالہ جی نے بھی دھوتی اُڑس لی

مسلمانوں کی عزیمت

خدا کا شکر ہے اب تک ہیں قائم ... مسلماں کی خصوصیاتِ نسلی
کفن سر سے لپیٹا غازیوں نے ... کمر آزاد ہو جانے پہ کس لی

لاہور - ۱۱ - اپریل ۱۹۳۳ء

(۱۱۷)

ارمغانِ قادیاں!

تم کو گر منظور ہے سیرِ جہانِ قادیاں — اے مسلمانو خریدو "ارمغانِ قادیاں"

جی کو بہلاؤ گے کیونکر گر نہ لوگے یہ کتاب — کیونکہ مٹ جانے کو ہے نام ونشانِ قادیاں

اس بجھارت کو نہ بُوجھا آج تک کوئی ادیب — مَیں نے ہی آخر کو حل کی چیستانِ قادیاں

میرے ہی خامہ کی رنگینی تھی جس کے فیض سے — ہو گئی سُننے کے قابل داستانِ قادیاں

مَیں نے دی اس کو لگام اور ہو گیا اس پہ سوار — ورنہ کس کو مانتی تھی مادیانِ قادیاں

کس طرح ممکن ہے دل پر ہو کسی کو اختیار — جب ہوں دل کے چھیننے والے بُتانِ قادیاں

مجھ سے پُوچھو کیوں فدا ہے قادیاں کشمیر پر — مجھ سے بڑھ کر کون ہو گا رازدانِ قادیاں

جو مجاور ہیں بہشتی مقبرہ کے آج کل — بیچتے پھرتے ہیں گھر گھر استخوانِ قادیاں

صرف غائب نحو عنقا اور سلاست ناپدید — ان سب اجزا سے مرکب ہے زبانِ قادیاں

"کُل برہنہ سے نہ یہ ہو گا کہ تا باندھے ازار" — یہ کہتا ہے شاہکارِ شاعرانِ قادیاں

لوگ حیراں تھے کہ جب پھیکا ہی پکوان اس قدر — ہو گئی پھر اتنی اُونچی کیوں دکانِ قادیاں

جو فروشی کے لئے گندم نمائی شرط تھی — تھا بڑا ہی کائیاں بازارگانِ قادیاں

کیا سلوک ان سے روا رکھتے ہیں منکر اور نکیر — قبر میں خود دیکھ لیں گے منکرانِ قادیاں

لاہور - ۱۱ - اپریل ۱۹۵۳ء

(۱۱۸)

بیساکھی

زبانِ حال سے کہتی ہے آج "بیساکھی" — کہ میرے بل پہ نہ ہوگی کبھی وطن آزاد
کھڑے نہ ہوں گے وہ اپنے ہی پاؤں پر جب تک — محال ہے کہ ہوں شیخ اور برہمن آزاد
یہی نتیجہ نکلنا تھا دھن کی پوجا کا — کہ ہو سکا نہ تن آزاد اور نہ من آزاد
یہ کیا غضب ہے کہ ہندوستاں غلام رہے — مگر ہو دیکھتے ہی دیکھتے ختن آزاد
سری کرشن نے گاندھی سے خواب میں یہ کہا — کریں گے دیس کو مجھ جیسے تیغ زن آزاد

مؤدبانہ موالات نے جواب دیا
ہمیں کرے گا ہمارا ولنگڈن آزاد

۱۲-اپریل ۱۹۳۴ء

(۱۱۹)

نئے نئے خمستان

اور

نئے نئے پیرِ مغاں

پکچھ ایسے مفتیانِ دیں بھی ہیں جن کا یہ فتویٰ ہے ○

کہ گاندھی ہی کھرے کھوٹے کے ہیں پہچاننے والے

شراب آئے گی لندن سے تو خُم کے خُم لُنڈھا دیں گے

اُنہیں اس دور کا پیرِ مغاں گردانئے والے

نکل کر جیل سے یاروں نے لی ہے راہ کونسل کی

ملیں گے سینکڑوں خاک اِس گلی کی چھاننے والے

بجز دو چار تقریروں کے رکھا ہی یہاں کیا ہے
اور اس کو جانتے ہیں کونسلوں کے جانے والے

نہ مسجد ہی میں زور ان کا نہ کالج ہی میں شور ان کا
چھپے کس گوشہ میں جا کر خدا کے ماننے والے

کہاں ہیں آنے والے باندھ کر تیغ و کفن رن میں
کدھر ہیں برچھیوں کے آگے سینے تاننے والے

اگر ہندوستاں میں دین کی حرمت پہ حرف آیا
تو اس پر کٹ مریں گے ہم یہ جی میں ٹھاننے والے

لاہور
۲۱-اپریل ۱۹۳۴ء

(۱۲۰)

سرکارِ دوعالم کا دربار

وہ سفارش کر رہے ہیں دین کی پچر نکال / میں گزارش کر رہا ہوں کفر ہی کی کر نکال

منکرِ ختمِ نبوّت ہو رہا ہے قادیاں / آگیا وقتِ جہاد ایمان کا خنجر نکال

کہہ دو مرزا سے کہ خاکِ کعبہ اُڑ سکتی نہیں / اپنے دل سے یہ تمنّائے جنوں پرور نکال

کائنات آنگن ہے اس کی اور ہے چھت عرشِ بریں / تو بھی کوئی گھر نکال اس سے مگر بہتر نکال

اس کو ڈھا کر دوسرا گھر شوق سے بنوا مگر / ابنِ آذر سے کوئی معمار بھی بڑھ کر نکال

سورج اس کا آئینہ ہے چاند اس کی شمع ہے / تو بھی اک گھر جس کے یوں روشن ہوں بام و در نکال

مجھ کو دربارِ رسول اللہ میں جانا ہے آج / نذر کو اے میری چشمِ تر کوئی گوہر نکال

گوشۂ دل سے کوئی چلتا ہوا جادو دکھا / منقلِ جاں سے کوئی جلتا ہوا اخگر نکال

چاک ہو اے سینۂ مسلم بیانِ خاوراں / اور پھر اُس سے آفتابِ دینِ پیغمبر نکال

سنگِ اسود کو دیا بوسہ رسولؐ اللہ نے — تو بھی اے طور ایک تو اس وضع کا پتھر نکال

حوصلے یوں ہی نکلتے جائیں گے اے دل ترے — آنکھ سے قلزم بہا اور آہ سے آذر نکال

دولتِ قرآں تجھے دیتے گئے ختم الرسلؐ — کھینچ خطِ تدبیر کا تقدیر کا مسطر نکال

صفوتِ صدیقِ اکبر کی دکھا کوئی ادا — سطوتِ فاروقِ اعظم کا کوئی جوہر نکال

ہے عروسِ دینِ قیّم ایک شرمیلی دلہن — اس کی زینت کے لیے عثماں کا زیور نکال

شیوۂ مشکل کشائی ہے تری طرزِ قدیم = بازوئے خیبر شکن سے قوّتِ صفدر نکال

حق کے آگے سر جھکا باطل کی قوت سے نہ دب — دل سے غیر اللہ کا ہر مرگ پرور ڈر نکال

تو غزل خوانی پہ آ جائے تو ہی خواجوئے وقت

زلفِ عنبر بار سے کژدم بکھیر اژدر نکال

لاہور

۲۶ مئی ۱۹۳۲ء

(۱۲۱)

نیلی پوشوں کا ترانہ

حق کی شان دکھانے آیا سچی بات سنانے آیا
باطل سے ٹکرانے آیا باطل کا گھر ڈھانے آیا

لشکر نیلی پوشوں کا

لشکر نیلی پوشوں کا بھئی لشکر نیلی پوشوں کا

روٹھے ہوؤں کو منانے آیا بچھڑے ہوؤں کو ملانے آیا
سوتے ہوؤں کو جگانے آیا ہٹتے ہوؤں کو بڑھانے آیا

لشکر نیلی پوشوں کا

لشکر نیلی پوشوں کا بھئی لشکر نیلی پوشوں کا

سلطانپور کی یاد کا نقشہ ظالم کی بیداد کا نقشہ
بیکس کی فریاد کا نقشہ کھینچنے اور کھنچوانے آیا

لشکر نیلی پوشوں کا

لشکر نیلی پوشوں کا بھئی لشکر نیلی پوشوں کا

بجنے لگا اسلام کا ڈنکا جبریل الہام کا ڈنکا
پیارے نبی کے نام کا ڈنکا دین کا رنگ جمانے آیا

لشکر نیلی پوشوں کا

لشکر نیلی پوشوں کا بھئی لشکر نیلی پوشوں کا

جالندھر
۷۔ جون سنہ ۱۹۳۲ء

(۱۲۲)

یک رنگی

ازل سے رنگ ہی اسلامیوں کا صبغۃ اللّٰہی
مسلمانو دو رنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جاؤ

تمہیں باطل نے للکارا ہی پھر کب وقت آئیگا
کہ تم بھی گوش بر آواز طبل جنگ ہو جاؤ

کبھی گونجا تھا جس کے زیر و بم سے ایشیا سارا
عرب کا پھر وہی سازِ بلند آہنگ ہو جاؤ

علی کے بازوے مرحب فگن کی آزمائش سے
زمانہ میں حریفِ طاقتِ افرنگ ہو جاؤ

پہن کر جامۂ نیلی اگر فریاد کرنی ہے
زمیں پر آسماں ہی کے نہ کیوں ہم سنگ ہو جاؤ

مری فطرت لگانے جا رہی ہی غوطہ زمزم میں
تم اپنی پوتھیوں کے ساتھ غرقِ گنگ ہو جاؤ

سخنور جس قدر ہیں ہند میں اُن سے کوئی کہہ دے
کہ اس نظمِ مرصع کو پڑھو اور دنگ ہو جاؤ

جالندھر ۔ ۸ ۔ جون ۱۹۳۷ء

(۱۲۳)

شہدائے سلطان پور کی یاد میں

کوئی سُنے نہ سُنے ربِ کعبہ نے تو سُنا — بیاں کپور تھلہ کے ستم رسیدوں کا
وہ خاک کیوں نہ ہو ہمرنگِ کربلا جس پر — بہا ہو خون مسلمان کی امیدوں کا
کفن لپیٹ کے سر سے چلے جو مقتل کو — تو حوریں آئیں کہ مُنہ چوم لیں شہیدوں کا
یہ دیکھنا ہے کہ ہوتی ہے فتح کس کو نصیب — مقابلہ ہے یزیدوں سے بایزیدوں کا
ہوئے غمِ شہدا میں سب آج نیلی پوش — یہ ہے اثر مرے نیلوفری قصیدوں کا
لگے ہیں کُشتوں کے میداں میں ہر طرف پُشتے — حساب ہوگا قیامت میں سر بریدوں کا

ملا ہے رحمتِ باری سے مردِ مومن کو
سراغ ارض و سماوات کی کلیدوں کا

(۱۲۴)

جیشِ نیلی پوشانِ جالندھر

شریعت کا شکنجہ ہند میں جب سے ہُوا ڈھیلا
مسلمانوں کا آٹا مفلسی میں ہو گیا گیلا

خدا وہ دن کرے حکمت کے چرچے ہوں مدارس میں
مساجد میں ہو شغلِ رتّل القرآن ترتیلا

اُدھر سے بیکسوں کی آئیں سلطانپور سے آہیں
اِدھر جالندھر اُٹھ بیٹھا پہن کر پیرہن نیلا

ستمگر کیا جواب اللہ کے دربار میں دیں گے
جہاں چلتا نہیں دُنیا کی طاقت کا کوئی حیلہ

رضاکارانِ جالندھر مسلماں ہوتے جاتے ہیں
جسے دیکھا تھا کل ڈھیلا وہی ہے آج پھرتیلا

جالندھر ۔ ۹ ۔ جون ۱۹۳۷ء

(۱۲۵)

رقصِ سپند

اس وقت ہے کپور تھلہ کا عجیب حال ‏— جلتے توے پہ ناچ رہے کچھ سپند ہیں

پیری کے دن ہیں اور ہیں جوانی کے ولولے ‏— پیرس میں وہ لگا رہے الٹی زقند ہیں

راعی ہی مال مست رعایا ہی حال مست ‏— اور ہو کے مست کہتے ہیں ہم ہوشمند ہیں

عبدالحمید جاتے ہیں موٹر میں جس طرف ‏— مایا ملی نہ رام کے نعرے بلند ہیں

جن ہندوؤں کے آگے جھکایا سر آپ نے ‏— سب آپ کے طریقے انہیں ناپسند ہیں

ہندو سبھا جو لوٹ کے حضرت کو کھا گئی ‏— کہتی ہے اب کہ آپ بڑے نادہند ہیں

احساں سے جن کو لاد دیا آپ نے وہی ‏— پہنچا رہے ہر ایک طرح کے گزند ہیں

اس ابتلا میں آپ کے کام آئے آج کون ‏— دیتے جو ساتھ آج وہ زنداں میں بند ہیں

داروئے تلخ جو ہے مرض کے لئے مفید

وہ اس نیازمند کے نکتے یہ چند ہیں

جون ۱۹۳۲ء

(۱۳۶)

لالہ نانک چند ناز کی شاعری

کہہ لیتے ہیں ناز شعر لیکن ملتا نہیں پڑھ کے اُن کو آنند

ہے شعر وُہی جو چٹکیاں لے دل میں کسی پدمنی کی مانند

یہ نکتہ سُنا تو سر کو دُھن کر فرمانے لگے رشی دیا نند

ہے ناز کی نظم کا یہ نقشہ دندان تو جملہ در دہانند

چشمان تو زیر ابروانند

امرتسر۔ ۱۰۔جون ۱۹۳۲ء

(۱۲۷)

نوجوان افغان سے خطاب

اے کہ تیرا منتظر ہے جنگ کا میدان اُٹھ
باندھ کر تیغ و کفن اے نوجوان افغان اُٹھ

نا وہ توحید بے ساماں ہو سکتا نہیں
لے کہ ہے سب سے بڑا ساماں ترا قرآن اُٹھ

جس نے دی آتے ہی آزادی کی انساں کو نوید
تو اُسی اسلام کی ہے اولیں برہان اُٹھ

غلغلہ تکبیر کا افلاک کے گنبد میں ڈال
اپنی سرحد سے اُٹھ اور بن کر خدا کی شان اُٹھ

تو نے دی ہے بارہا باطل کی فوجوں کو شکست
امرِ حق کا آج پھر کرتا ہوا اعلان اُٹھ

سرنگوں ہونے نہ پائے دینِ قیّم کا عَلَم
اس کی عزت پہ تجھے کرنی ہے جاں قربان اُٹھ

حکم فاسجد واقترب کا ساری دنیا کو سنا
ہاتھ میں لے کر یہ فرمانِ قضا جریان اُٹھ

غرق ہونے سے نہ بچنے پائے بیڑا کفر کا
تجھ کو اُٹھنا ہے تو ہو کر نوح کا طوفان اُٹھ

گھر محمدؐ کا جو تھا آباد ویراں ہو چلا
بے خبر سوتا ہے گا کب تک او دربان اُٹھ

ایبٹ آباد - ۳۱ - جون ۱۹۳۷ء

(۱۲۸)

سرحد کا غیور مسلمان

اُدھر ہے خمکدہ یثرب کے مے فروشوں کا | اِدھر ہے ظرف پشاور کے بادہ نوشوں کا
جو دیکھنی ہو نبیؐ کے جلال کی تصویر | تو چہرہ دیکھ تو سرحد کے سرفروشوں کا
کریں گے اُٹھ کے وطن کا علم بلند یہی | کہ ہے یہ کام انہیں جیسے سخت کوشوں کا
وطن ہے دین اور اُس کا شرف یہ کہتا ہے | کہ پاسباں ہوں میں دیدۂ حرم کے گوشوں کا

بڑھا ہے صبر کہ دے جبر کی سپہ کو شکست
مقابلہ ہے حکومت سے سُرخ پوشوں کا

۳۰ جون ۱۹۳۷ء

(۱۲۹)

دیوان کپورتھلہ

اور

"زمیندار" کی نوک جھونک

عبدالحمید نے یہ بڑے فخر سے کہا — بخشی گئی ہے قفل قضا کی مجھے کلید

میرے لئے ہے خون مسلمان کا روا — میرے خدنگ ناز کا اسلام ہے شہید

آجائے جس کے ہاتھ میں ہندو سبھا کی باگ — وہ کس لئے ہو اپنی وزارت سے نا اُمید

جب کنجیاں خزانہ کی ہوں میری جیب میں — کیوں ہو نہ جائیں سارے جرائد مرے مُرید

کیوں میرے حق میں بنک کے چالے کے آنہ جائیں — ہر گوشہ سے شہادتیں اور وہ بھی چشم دید

ایمان بیچنے پہ ہے دُنیا تُلی ہوئی — کیوں نقد دام دے کے نہ لُوں اس کو میں خرید

کیوں مجھ پہ کر رہا ہے "زمیندار" اعتراض — یہ نکتہ چینیاں نہ پڑیں گی اُسے مفید

یہ لام کاف سُن کے "زمیندار" نے کہا — اے سامری کے نسخہ کے دیباچۂ جدید

دُنیا یزیدیوں سے ہی بیشک بھری ہوئی — لیکن یہ جھوٹ ہے کہ نہیں اس میں بایزید

رندانِ ہند اب بھی ہیں مست اُس شراب کے — خمخانۂ حجاز میں جس کی ہوئی کشید

میرا یہ کام ہے کہ کروں تجھ کو انتباہ — اللہ کی گرفت کا خمیازہ ہے شدید

دروازہ توبہ کا ہے ابھی تک کھلا ہوا — ایسا نہ ہو کہ مل نہ سکے مہلت مزید

سارا یہ طمطراق ہے جس کا تجھے غرور — اس انتظار میں ہے کہ ہو جلد ناپدید

ڈوبی ہوئی اثر میں ہے میری ہر اک دُعا
آئی ہے عرش سے مرے مکتوب کی رسید

۱۲۔ اگست ۱۹۳۴ء

(۱۳۰)

میرا وظیفہ

لاٹھی نہیں کہ کفر کے سر پر گھماؤں میں
مانا کہ اس ہنر میں بھی ہے مجھ کو دسترس!

وہ دن گئے کہ سکّۂ اسلام تھا رواں
اقصائے چیں سے تا بہ سوادِ طرابلس!

وہ دن گئے کہ ایک مسلماں کے سامنے
کافر ٹھہر نہ سکتے تھے ہوتے وہ خواہ دس

افسانہ ہو کے رہ گئی اُس تربیت کی یاد
جس نے بنا دیا تھا کبھی ناکسوں کو کس

ہندوستاں میں آج مسلماں کا ہے یہ حال
فرماتے ہیں بفخر نبیرگانِ نکتہ رس

کیا کم ہے یہ شرف کہ ہوں انگریز کا غلام
اور اس شرف کی عمر بھی ہے ڈیڑھ سو برس

اِس خفتہ بخت قوم کو کیونکر جگاؤں میں
ہوتی نہیں ہے اُمّتِ مرحوم ٹس سے مس

آئے گی یہ فقط ترے چھینٹوں سے ہوش میں
بطحا کی اے گھٹا برس اور جھوم کر برس

اے ربِّ کعبہ لا اُسی دریا کی ایک موج
دُنیائے کُفر بہ گئی تھی جس میں بن کے خس!

کابل سے تا بہ انقرہ طہراں سے تا بہ نجد
ہو لطمہ زن یہ موج چپ و راس و پیش و پس!

میرا یہ کام ہے کہ دُعائیں کیا کروں
اس سے نہیں غرض کہ سنیں ان کو ہم نفس

بھولا نہیں ہوں خواجہ شیراز کا یہ قول
حافظ وظیفۂ تو دُعا گفتن است و بس

در بندِ آں مباش کہ نشنید یا شنید

۱۸ اگست ۱۹۳۶ء

(۱۳۱)

محبت

("پنچ" کے کرشن نمبر کے لئے)

کرشن آئے کہ دیں پھر بھر کے وحدت کے خمستاں سے
شراب معرفت کا روح پرور جام ہندو کو

کرشن آئے اور اس باطل ربا مقصد کے ساتھ آئے
کہ دنیا بت پرستی کا نہ دے الزام ہندو کو

کرشن آئے کہ تلواروں کی جھنکاروں میں دے جائیں
حیات جاوداں کا سرمدی انعام ہندو کو

اگر خوف خدا دل میں ہے پھر کیوں موت کا ڈر ہو
کرشن آئیں تو اب بھی دیں یہی پیغام ہندو کو

مسلمانوں کے دل میں بھی ادب ہے ان حقایق کا
سکھاتا ہے یہی سچائیاں اسلام ہندو کو

وہ میرے جذبۂ دل کی کشش کا لاکھ منکر ہو
محبت سے میں آخر کر ہی لوں گا رام ہندو کو

۲۶۔ اگست ۱۹۳۴ء

(۱۳۲)

جنم اشٹمی

مسلمانوں اور ہندوؤں کے سیاسی اختلافات نے اگرچہ ان دونوں قوموں کے صحافتی اداروں کو ایک دوسرے کا مستقل حریف بنا رکھا ہے۔ لیکن ہندو کی خاص خاص نیم مذہبی و نیم سیاسی تقریبوں پر جب اُن کے اخبارات خاص نمبر نکالتے ہیں۔ تو ہندو صحافت کا تجارتی سلیقہ اسے اپنے اسلامی حریفوں سے ان نمبروں کے لئے کسی مضمون نظم و نثر کی فرمایش کرنے میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا۔ مجھ سے بارہا اس قسم کی فرمائشیں ہوئیں اور میری موحدانہ کشادہ دلی نے ہر موقع پر ان فرمائشوں کو پورا کیا۔ جنم اشٹمی کی ایسی ہی تازہ تقریب پر "پرتاپ" کے مدیر معاون لالہ وزیر چند صاحب تشریف لائے۔ اور نظم کا تقاضا کیا۔ میں نے ذیل کی نظم قلم برداشتہ لکھ کر اُن کے حوالے کر دی جس کے آخری شعر نے شاید اُن کو اس نظم کی اشاعت کی توفیق نہ دی ہو کیونکہ "پرتاپ" کا یہ خاص جنم اشٹمی نمبر میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔

وزیر چند نے پوچھا ظفر علی خاں سے
سری کرشن سے کیا تم کو بھی ارادت ہے

کہا یہ اُس نے وہ تھے اپنے وقت کے ہادی
اِسی لئے ادب اُن کا مری سعادت ہے

فساد سے انہیں نفرت تھی جو ہی مجھ کو بھی
اور اس پہ دے رہی فطرت مری شہادت ہے

ہے اس وطن میں اک ایسا گروہ بھی موجود
سری کرشن کی جو کر رہا عبادت ہے

مگر فساد ہے اُس کی سرشت میں داخل
بچارے کیا کریں پڑ ہی چکی یہ عادت ہے

لاہور
یکم ستمبر ۱۹۳۷ء

(۱۳۴)

کتاب زندگی

مؤلفہ چودھری افضل حق صاحب رکن مجلس احرار اسلام

کھل گیا ہر ذی بصیرت پر معمائے حیات ۔۔۔ جب سے فضل حق نے لکھی ہے کتاب زندگی

لفظ لفظ اس کا ہے ملت کے لئے درس عمل ۔۔۔ حرف حرف اس کا ہے غوغائے رباب زندگی

ساقی فضل حق ہے اور خمخانہ ہے احرار کا ۔۔۔ کیوں نہ چھلکے پھر یہیں جام شراب زندگی

حسن تھا بازیچہ آویزش عشق و ہوس ۔۔۔ بس یہی اک نکتہ ہے تعبیر خواب زندگی

کفر کیا ہے؟ قادیانیت کی رسوائی کی لاش ۔۔۔ منہ پہ جس نے ڈال رکھی ہے نقاب زندگی

زندگی کا لطف اسی میں ہے کہ ہم آزاد ہوں ۔۔۔ غیر کا محکوم ہونا ہے عذاب زندگی

رات اندھیری تھی بھٹکتا پھر رہا تھا کارواں ۔۔۔ دفعتہ نکلا چمک کر آفتاب زندگی

موت کے ڈر سے کیا فارغ رسول اللہ نے ۔۔۔ جن کی رحمت سے ہوا مفتوح باب زندگی

وقت پر جن کی شفاعت کا سہارا مل گیا

پیش جب کرنا پڑا ہم کو حساب زندگی ع

لاہور

۷ ستمبر ۱۹۳۴ء

(۱۳۴)

علی گڑھ کے نوجوانوں کا فیصلہ

اُدھر ہے جبر کی آن اور ادھر ہے صبر کی شان
مقابلہ ہے توانا سے ناتوانوں کا

اُدھر ہے قایدِ افواجِ ہند کی للکار
اِدھر سکوت صف آرا ہے بے زبانوں کا

اُدھر غرورِ حکومت کے طنطنے کی نمود
اِدھر مظاہرہ دس بیس نیم جانوں کا

سراغ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کونسلوں میں ہم
وطن کی عزتِ گم گشتہ کے نشانوں کا

نہ کٹ سکیں اگر اُن سے ہماری زنجیریں
تو مسجدوں میں عبث شور ہے اذانوں کا

ہمارے سر پہ مسلّط نہ کیوں ہوں بیگانے
ہوا اختلاف خود آپس میں جب یگانوں کا

نہیں رہی وہ تڑپ دل میں جو الٹتی تھی
پلوں میں تختِ جہاں کے خدایگانوں کا

کبھی چلائے تھے بیڑے جنھوں نے خشکی پر
ہے عزم آج کہاں اُن جہازرانوں کا

ہزار حیف کہ مٹی میں مل رہا ہے وقار
حریمِ کعبہ کی حرمت کے پاسبانوں کا

ہمارے بسنے کے قابل نہیں رہا یہ وطن
یہ فیصلہ ہے علی گڑھ کے نوجوانوں کا

لاہور
۹ ستمبر ۱۹۳۴ء

(۱۳۵)

زلزلہ فنڈ

راہِ خدا پہ تین حرف، راہ ہے راہِ ویسرا
مانگنے جا رہا ہوں بھیک زلزلہ فنڈ کے لئے

فضل حسین ہو گئے زخمِ جگر کے چارہ گر
مرہمِ عیسوی ملا اس کے کفرِ نڈ کے لئے

میرے غرفد کا نشاں فخرِ رُسل کی خاکِ در
گردِ رہِ کلیسیا اُن کے گھمنڈ کے لئے

لاہور
۱۵ ستمبر ۱۹۳۴ء

(١٣٦)

ملّت کے سوادِ اعظم کی آواز

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں تاجدار دکن کے گوشِ حق نیوش کے لئے

اے کہ تیرے نام کا ڈنکا بجاتا ہے دکن
اے کہ تیری ذات ہے فخرِ سلاطینِ زمن

اے کہ تیرے قصرِ دولت پر ہوئی پرتو فشاں
دینِ پیغمبر کے عالمتاب سورج کی کرن

اے کہ ہے تجھ سے روایاتِ سلف کی آبرو
اے کہ تُو نے کر دیا ہے زندہ آئینِ کہن

اے کہ تیرے دل میں ہے سودائے حُبِّ اہلبیت
اے کہ تیرے دل میں ہے پیوست عشقِ پنجتن

مجھ کو بھی آلِ عبا سے ہے ارادت بے حساب
میری گردن میں بھی ہے اُس کی عقیدت کی رسن

میں بھی ہوں ابن ابی طالب کا اک ادنیٰ غلام
میری آنکھوں میں ہے جس کی سطوتِ خیبر فگن

اور پکار اُٹھتا ہوں میں بھی لافتیٰ الّا علی
جب کسی میدان میں گھمسان کا پڑتا ہے رن

میرے اس مضموں کو لیکن چاہیئے وسعت کچھ اور
جس کی گنجائش نکالے گا مرا دیوانہ پن

میں ابوبکر و عمر پر بھی ہوں سو جاں سے نثار
مجھ سے سیکھے کوئی ان کے نام چمکانے کا فن

گنبد خضرا شہادت دے رہا ہے آج تک
پائنتی ہے خواجۂ کونین کی ان کا وطن

لرزہ ہو جاتا تھا طاری کفر کے اندام پر
ابروئے صدیق اکبر پر جو پڑتی تھی شکن

جب عمر کا نعرۂ مستانہ ہوتا تھا بلند
نشہ ہو جاتا تھا روما کا اور ایراں کا ہرن

اس میں بوبکر و عمر ہوں یا ہوں عثمان و علی
سب کی خوشبو سے مہکتا ہے خلافت کا چمن

زندہ و پائندہ ہے وہ دل الیٰ یوم التناد
جس میں ان چاروں کی الفت کا ہے دریا موج زن

یہ سواد اعظم اسلام کی آواز ہے
اے کہ تیرے نام کا ڈنکا بجاتا ہے دکن

لاہور
۱۶ ستمبر ۱۹۳۴ء

(۱۳۷)

مولوی اور مالوی

دینے آتے ہیں بنارس سے وہ آزادی کا درس
رکھتے ہیں انگریز سے در پردہ لیکن رسم و راہ

مولوی بے چارے کو آتے ہیں کب یہ چھل فریب
مالوی کے ہتھکنڈوں سے ربِّ اکبر کی پناہ

بوالکلام آزاد کا کس طرح دے سکتے ہیں ساتھ
ہو نہیں سکتا ہے گاندھی جی سے بھی جن کا نباہ

حرص اتنی ہے کہ موہن بھوگ کھاتے ہیں، مگر
ہے مسلمانوں کی روکھی سوکھی روٹی پر نگاہ

جلسہ گاہوں میں زباں پر نعرۂ حبِّ وطن
دل میں لیکن ٹامیوں کے بوٹ کی ٹھوکر کی چاہ

پہلے درجے کے منافق ہیں ہم اہلِ ہند بھی
سبحہ در کف توبہ بر لب دل پُر از شوقِ گناہ

معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

لاہور
۲۷ ستمبر ۱۹۳۷ء

(۱۳۸)

ماکیانِ مشرق!

جمہوریہ شورائیہ روس کے نمایندہ خاص موسیو لٹوینیاف کو جمعیۃ الاقوام کی شرکت پر مبارکباد دینے کی غرض سے ایک پر رونق جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ جب مبارک سلامت کا غل تھما تو موسیو لٹوینیاف نے اپنے بلند پایہ میزبانوں کا رسمی شکریہ ادا کرتے ہوئے جن کی ملوکانہ شیرینی میں اشتراکیت کی تلخی سے بھی زیادہ ملی ہوئی تھی فرمایا اور کس ستم ظریفانہ انداز میں فرمایا کہ "روسی اشتراکیت جینوا کی بھری محفل میں آئی ہے تاکہ سرمایہ داروں کی گردن میں ہاتھ ڈال کر ناچے۔ لیکن ایک بات وہ اپنے گھر سے جی میں ٹھان کر آئی ہے۔ وہ یورپ کے ساتھ مل کر ناچے گی ضرور لیکن بھاؤ اپنا ہی بتائے گی"۔ جینوا کی محفل کی رنگین روداد کا نقشہ میں نے الفاظ ذیل میں کھینچا ہے:-

مغرب میں تھا یہ شور کہ مشرق کی ماکیاں — آباد گھر کرے گی ہمارے خروس کا

مرغی نے جب یہ نعرہ سنا اس جھڑوس کا — پر پھڑپھڑا کے کیا ہی مزے کا دیا جواب

ناچوں گی میں ضرور تمہارے ساتھ بال میں — لیکن بتائے جاؤں گی میں بھاؤ روس کا

اس شرط پر بندھا ہے جینوا میں آج عقد
برطانیہ سے روس کی اس نو عروس کا

لاہور
۲۷ ستمبر ۱۹۳۴ء

(۱۳۹)

تعزیرِ جرمِ عشق

ناموسِ پیمبر کا نگہباں ہے "زمیندار"
پلول کے گدھے کو بھی ہے اس جرم کا اقرار

اس عہد میں یہ جُرم نہیں عفو کے قابل
گھورے نہ اسے کیوں نگہِ قہر سے سرکار

حیرت ہے کہ مانگی گئی کیوں اس سے ضمانت
جب ایسے گناہوں کی سزا ہے رسن و دار

حق بات کے کہنے سے یہ ہرگز نہیں ٹلتا
چھوڑے گا نہ اس اپنی روش کو یہ گنہگار

اب بھی یہی بہتر ہے کہ دیجے اسے سُولی
گولی سے اُڑا دیجئے اس کو سرِ بازار

لاہور
۱۹-اکتوبر ۱۹۳۴ء

(۱۴۰)

نقارۂ خدا

جھوٹوں کی یگانہ یہ کوشش ہے کہ دب جائے
سچوں کی جماعت کے علمدار کی آواز

سن لیں جنہیں بخشی گئی ہو سننے کی توفیق
ہوگی نہ کبھی بند "زمیندار" کی آواز

یثرب سے پھر اٹھی ہے کہ سوتوں کو جگا دے
شاہ دوسرا احمد مختار کی آواز

بجتا نہ سنا جس نے ہو نقارۂ خدا کا
سن لے وہ غریبوں کے اس اخبار کی آواز

غوغائے قیامت سے کسی طرح نہیں کم
ناموس پیمبر کے نگہدار کی آواز

یہ شور کسی طرح دبائے نہ دبے گا!
لاکھوں کی صدا ہے نہیں دو چار کی آواز

یہ غلغلہ ہے سلطنت ملت بیضا
یہ ہمہمہ ہے معشر ابرار کی آواز

باز آ نہ سکا حق کی حمایت سے "زمیندار"
صحرا کی صدا ہو گئی اشرار کی آواز

(۱۴۱)

پناہ بخدا

نبیؐ کے بعد نبوّت کا ادعا ہو جسے — ہر ایسے بطلِ خرافات سے خدا کی پناہ

نئے صنم کدہ میں آگئے نئے نئے بُت — نئے بُتوں کی نئی گھات سے خدا کی پناہ

ٹپّی ٹپّی ہے اُدھر اور اِدھر غلام احمد — ہزار بار ان آفات سے خدا کی پناہ

خدا بچائے ہمیں اُن کے ساتھ ملنے سے — منافقوں کی موالات سے خدا کی پناہ

جو بن کے بُو علی آئے حکیم نور الدین — تو بُو علی کی "اشارات" سے خدا کی پناہ

کسی خدا کا تو قائل ہے قادیاں بھی ضرور — جو مانگتا ہے "فکاہات" سے خدا کی پناہ

بنے جو باپ خدا کا اور اُس کی بیوی بھی — ہر ایسے مسخرے کی ذات سے خدا کی پناہ

ان ابلہانہ حکایات پر نبی کی سنوار — ان احمقانہ روایات سے خدا کی پناہ

وزیرِ ہند کا لطفِ کہن معاذ اللہ — اور اُن کی تازہ عنایات سے خدا کی پناہ

یہی ہو مرتبہ ایماں کا جو ہے درجۂ کفر — اس آج کل کی مساوات سے خدا کی پناہ

اگر کرامت پیرِ حرم ہے استدراج

تو پیر اور اُس کی کرامات سے خدا کی پناہ

لاہور
۲۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء

(۱۴۲)

پلول کا گدھا

پلول کے سرکاری اصطبل کے ایک گدھے کا نام اس اصطبل کے متعصب ہندو منتظم نے حضور سرورِ کون و مکان کے نام پر احمد رکھا۔ رسول اللہ کی اس کھلی ہوئی توہین پر سارے پنجاب اور سارے ہندوستان میں غم و غصہ کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ "زمیندار" نے پے بہ پے مقالے لکھ کر اس حرکت کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ اس احتجاج کی اُسے یہ سزا ملی کہ اس کا ہزاروں روپیہ کا مطبع ضبط کر لیا گیا اور دوبارہ چار ہزار روپیہ کی ضمانت لے لی گئی۔ ذیل کی نظم اس واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی:۔

جانتا ہوں کہ کیا ملے گا جواب مجھ کو سرکار کے سکتر سے

دل اگر ہو کسی قدر فارغ قادیاں کے خلیفہ کے ڈر سے

تو سکندر حیات ہی پوچھیں جا کے پنجاب کے گورنر سے

کیا "زمیندار" کی خطا ہے کہ آپ طیش میں آ کے اس پہ یوں برسے

لی ضمانت تو وہ بھی چار ہزار — اس بلاکش کی جیب بے زر سے

کیا یہی اس غریب کا ہے قصور — کہ اُسے عشق ہے پیمبرؐ سے

جن کی توہین کی خبر آئی — آپ ہی کے طویلۂ خر سے

اور کیا اُس نے احتجاج اس پہ — آج جو ہے بلند گھر گھر سے

لوگ کہتے ہیں آپ کی خو بو — دفعتہً جا ملی ہے ہٹلر سے

ہمہ تن اضطراب ہے اسلام — پُوچھ لیجے ہرا پنے افسر سے

کیجئے سب ضمانتیں منسوخ — لیجئے یہ صلاح احقر سے

دل مسلماں کا لے کے مٹھی میں
ٹال دیجئے سب بلاؤں کو سر سے

لاہور - ۲۲ - اکتوبر ۱۹۳۴ء

(۱۴۳)

ناموسِ رسول کے تحفظ کی قیمت

"زمیندار" پریس کی ضبطی اور اخبار سے تین ہزار کی ضمانت

سرکار نے چھینا ہے "زمیندار" کا مطبع
مرزائیوں کے گھر میں جلے گھی کے چراغ آج

چمکائے گئے اُندلسی اور دمشقی
روشن ہوئے اسلام کے سینے کے یہ داغ آج

کیا طرفہ تماشا ہے کہ ہوں آ کے معارض
کعبہ کی عنادل سے کلیسا کے کلاغ آج

خمیازہ کشِ عشقِ رسولِ عربی ہوں
میرے دلِ مضطر کو میسر ہے فراغ آج

توحید کی دہلیز پہ ہوں ناصیہ فرسا
پہنچا ہے مرا عرشِ معلّٰی پہ دماغ آج

جو بوالہوسوں کو نہ ملی ہے نہ ملے گی
اُس دولتِ سرمد کا ملا مجھ کو سراغ آج

ہے جس کی ہر اک بوند میں کوثر کی ملونی
ساقی نے دیا مجھ کو وہ لبریز ایاغ آج

مرزائی بجاتے ہوئے بغلیں نکل آئے
خوش تھے کہ ہوا باغ "زمیندار" کا راغ آج

لیکن یہ خوشی تھی فقط اک عشرہ کی مہماں
پھر رحمتِ باری سے وہی راغ ہے باغ آج

لاہور - ۱۴ - نومبر ۱۹۳۴ء

(۱۴۴)

خالد لطیف گابا

اور

حاجی رحیم بخش کی انتخابی آویزش

اہلِ نظر نے دیکھے اسلام کے کرشمے
پہنچے اسمبلی میں خالد لطیف گابا

سرکار کا سہارا کچھ بھی نہ کام آیا
کھا کر شکست نکلے حاجی رحیم بابا

اُن کی مدد کو دوڑا وہ قادیاں کا ہیکل
فتنوں کی آگ جس میں جُھنتی ہی بے محابا

جب اُن کے ووٹ سے بھی مشکل نہ ہو سکی حل
حاجی نے حسرتوں کا بستہ بغل میں دابا

لاہور ۱۰۔ نومبر ۱۹۳۴ء

(۱۴۵)

زبیر کی عروس

مہاشہ خورسند کے صاحبزادہ زبیر کی عروسی کی تقریب میں دوسرے احباب کے ساتھ شرکت کی دعوت میرے نام بھی آئی۔ دلہن کا نام سوشیلا دیوی تھا۔ اس نام کی مناسبت سے اشعار ذیل مہاشہ خورسند کی نذر کئے گئے:۔

وہ سب ساماں ہو جس سے اہتمام بادہ نوشی ہو
مجھے بھی ہو شکست توبہ کی فکر آج اے ساقی

کہ اس گھر کو لگانے آ رہی ہے چاند سوشیلا
بڑھائی جا رہی ہیں رونقیں زبیر کے گھر کی

دلہن کو جذبۂ حبّ وطن یارب کرا ارزانی
ادھر وہ بھی ہو جوشیلی اگر دولہا ہے جوشیلا

لاہور
دسمبر ۱۹۳۴ء

(۱۴۶)

حفظ کلام اللہ کا درجہ

حافظ محمد رفیع صاحب تاجر دہلی کے یازدہ سالہ فرزند محمد یونس کو کلام اللہ حفظ کرنے کی سعادت ارزانی ہوئی۔ مولوی عظمت اللہ صاحب نے جو دفتر "الجمعیۃ" دہلی سے وابستہ تھے مجھ سے فرمائش کی کہ اس مبارک تقریب کے لئے کچھ اشعار کہہ دوں۔ نظم ذیل اس فرمائش کی تعمیل میں قلم برداشتہ لکھی گئی:-

یونس نے آج ختم کیا اُس کتاب کو — انسان جس کے پڑھنے سے انسان ہوگیا

گیارہ برس کی عمر کے بچے کے واسطے — دارین کی فلاح کا سامان ہوگیا

اسلامیوں کے ہاتھ میں جب آئی یہ کتاب — شیرازہ کافروں کا پریشان ہوگیا

ہر نقطہ اس کا بن گیا احسان کی نوید — ہر شوشہ اس کا مژدۂ ایمان ہوگیا

آکر دیا عرب کو نیا اس نے آب و رنگ — رنگیں اس آب و رنگ سے ایران ہوگیا

تلبیعد و کا نعرہ جب اُس نے کیا بلند — بوذر کوئی بنا کوئی سلمان ہوگیا

ملّت کی آبرو کو لگائے گا چار چاند

یونس جو آج حافظِ قرآن ہوگیا

دہلی

۸۔ دسمبر ۱۹۳۷ء

(۱۴۷)

لاتخف انک انت الاعلیٰ

"زمیندار" کے ایک قلمی معاون جناب طالوت نے "زمیندار" کی قربانیوں کا تذکرہ ایک نظم میں کیا جس کے تین شعر یہ تھے:۔

نہیں طاغوت اک طرف تنہا "زمیندار" اک طرف　　　رہتی دنیا تک یہ آویزش رہے گی یادگار
خانۂ باطل میں تجدید جانے لگی ماتم کی صف　　　حق کے جلوے صفحۂ گیتی پہ چھا جانے لگے

عزم راسخ نے فنا کر ڈالے سب شک و گماں
ہوگیا پیش نظر الحق یعلو کا سماں

اس پر ذیل کے دو اشعار میں نے بھی لکھ دیئے:۔

اس نے پایا ہے محمدؐ کی معیت کا شرف　　　اس کے سر پر سایہ ہے شام و پگاہ اللہ کا
کیوں نہ اس کے حوصلے آکر بڑھائے جبرئیل
کیوں نہ پہنچے عرش سے اس کو نوید لاتخف

۷۔ دسمبر ۱۹۳۴ء

(۱۴۸)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء

استعمار کی بھینس کا انڈا

صدرِ اعظم کی سخاوت میں نہیں ہم کو کلام
لیکن اُن سے پوچھتے ہیں ہم کہ ہم کو کیا دیا

کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لئے
اک کھلونا بھیج کر بچّوں کا دل بہلا دیا

اپنے پینے کے لئے شمپین بھر لی جام میں
ہند کے رندانِ دُرد آشام کو ٹھرّا دیا

میوہ خوری کے لئے چُننے لگے جب گول میز
رکھ لیا خود مغز چھلکوں پر ہمیں ٹرخا دیا

بھینس استعمار کی گابھن ہوئی مدّت کے بعد
اور بڑی دقّت سے اصلاحات کا انڈا دیا

لاہور ۔ ۱۲ جنوری ۱۹۳۵ء

(۱۴۹)

نعرۂ خروسی اور اُس کا جواب

فرنگستان کی مُرغی گھُسی مشرق کے ڈربے میں
اور آتے ہی دیا اُس نے نئی تہذیب کا انڈا

کھٹک کر جب یہ انڈا چوزہ نکلا ایک چتکبرا
تو اُس کی چونچ میں تھا مغربی آئین کا ڈنڈا

یہ ڈنڈا لے کے چوزہ چڑھ گیا دہلی کی ممٹی پر
جہاں روشن تھا پہلے ہی سے استعمار کا ہنڈا

وطن کے ذرہ ذرہ نے سُنی اُس کی یہ ککڑوں کوں
کچل دو کانگرس کا سر، جُھکا دو ہند کا جھنڈا

کہا برجستہ مَیں نے یہ خروسی نعرہ سُنتے ہی
وطن کا جوش اِس دھمکی سے ہو سکتا نہیں ٹھنڈا

لاہور ۔۔ ۲۰۔ جنوری ۱۹۳۵ء

(۱۵۰)

عید الاضحیٰ

۱۳۵۳ھ

عید اضحیٰ لائی ہے بطحا سے پیغامِ بقا
فاش کرنے آئی ہے یثرب سے قربانی کا راز

خنجرِ تسلیم کے کشتوں سے جا کر پوچھ لو
ملّتِ بیضا کی عزّت کی نگہبانی کا راز

اُمّیوں کے سر پہ تاجِ سطوتِ کبریٰ کا بھید
مفلسوں کے گھر میں دولت کی فراوانی کا راز

جن کے دل رہتے تھے خالی خوفِ غیر اللہ سے
اُن شتربانوں نے سمجھا تھا جہانبانی کا راز

جنسِ آزادی جو مہنگی تھی وہ سستی ہو گئی
کھل گیا اسلامیوں کے خوں کی ارزانی کا راز

آشکارا کر دیا جمعیّتِ اسلام نے
قادیانیّت کی روز افزوں پریشانی کا راز

داد دیتا ہے مرے اشعار کی روح الامیں
بسکہ سمجھا ہے وہی میری سخندانی کا راز

لاہور۔ ۱۵۔ مارچ ۱۹۳۵ء

(۱۵۱)

تہذیب جدید کا انڈا

تبلیغ کانفرنس چونڈہ میں یہ اشعار ارتجالاً کہے گئے:۔

اسلام کی تبلیغ کا مرکز ہے چونڈہ
اُڑتا ہے یہاں شرع کے ناموس کا جھنڈا

جب تک نہ زمانے سے نشاں کفر کا مٹ جائے
ہوگا نہ کبھی جوش مسلمان کا ٹھنڈا

مرزائیوں کے ہوش لگے ہونے فقرو
جس وقت بخاری نے لیا ہاتھ میں ڈنڈا

کرتے ہوئے چوں چوں نکل آئے متنبی
یورپ نے دیا جب نئی تہذیب کا انڈا

چونڈہ ضلع سیالکوٹ
یکم اپریل ۱۹۳۵ء

(۱۵۲)

مُنکرِ ختمِ نبوّت کا حشر

تبلیغ کانفرنس جموں میں نکتہ داں احباب کے اصرار پر یہ اشعار برسبیل ارتجال زباں پر آ گئے :۔

قادیانیت پہ کرسکتا وہی ہے انتقاد
منقلِ جاں میں ہو جس کی شعلہ زن جوشِ جہاد

جو رہا ہے عمر بھر زندانیٔ زلفِ فرنگ
جس کو انگریز نے دی رہ رہ کے اس جذبہ کی داد

جو رسول اللہ کے ناموس پہ قرباں ہوا
نامرادی میں بھی جو ثابت ہوا ہے بامُراد

جانتا ہے جو غلام احمد کی الماری کا بھید
پُرزے پُرزے کر دیا مرزا کا جس نے اجتہاد

جان سکتا ہے وہی مرزائیوں کی عاقبت
جس کے ہے پیشِ نظر حشرِ ثمود انجامِ عاد

مُنکرِ ختمِ نبوّت کے مقدّر میں ہے درج
ذلّت و خواری و رُسوائی الیٰ یوم التناد

جموں ۔ ۲۰ ۔ اپریل ۱۹۳۵ء

(۱۵۳)

جہانیاں

جو دیدہ ور ہیں اُن کو دکھا دے جہانیاں دینِ محمدِ عربی کی نشانیاں

ہندوستاں میں پھر اُسی دریا کی موج لا زمزم کی رو سے اٹھی تھیں جن کی روانیاں

اسلامیوں کے کان ہیں ناسور پڑ گئے سُن سُن کے قادیانیوں کی بدزبانیاں

ان میرزائیوں کی خرافات تابکے اسلام کی سنا ہمیں رنگیں کہانیاں

باطل کے زیر کرنے کی تدبیر ہے یہی
قربان حق کی راہ میں ہوں زندگانیاں

جہانیاں
۱۲۔اپریل ۱۹۳۵ء

(۱۵۴)

اسلام اور اُس کے حریف

بھائی پرمانند کی اُس غزل کے جواب میں جو اُنہوں نے ہندو مہاسبھا کے اجلاس دارجیلنگ میں گائی :-

سنگٹھنیوں کے دلوں میں یہی اک خواہش ہے
کہ مسلمان کی اس دیس میں ہستی نہ رہے

ربِّ کعبہ کا جہاں نام لیا جاتا ہو
کشورِ ہند میں ایسی کوئی بستی نہ رہے

پینے والوں کو ملے بادۂ گلرنگ کا جام
مگر اس بادہ میں توحید کی مستی نہ رہے

نرخ ناموس پیمبرؐ کا ہے خونِ شہدا
اب انہیں ضد ہے کہ یہ جنس بھی سستی نہ رہے

اگر اس قوم کو پالا مری ہمت سے پڑے
کمر اپنی وہ مرے قتل پہ کستی نہ رہے

پاک ابھی قصۂ غلامی کا ہوا جاتا ہے
اگر اس مُلک میں گوسالہ پرستی نہ رہے

رحمت اللہ کی ملّت کو اگر شامل ہو
تو وہ آزادیٔ کامل کو ترستی نہ رہے

لہلہاتی ہوئی اسلام کی کھیتی جل جائے
گر مدینہ کی گھٹا اس پہ برستی نہ رہے

اے خدا نام مسلماں کا ہو دُنیا میں بلند
اس بلندی کو کہیں خطرۂ پستی نہ رہے

لاہور
۲۰۔ اپریل ۱۹۳۵ء

(۱۵۵)

وفادارانِ مادرزاد

مرزا سر ظفر علی نے قادیانیوں کو از روئے شریعت دائرہ اسلام سے خارج سمجھ کر حکومت سے انہیں ایک جداگانہ جماعت قرار دینے کا مطالبہ کیا کیا بھڑوں کے ایک چھتہ کو چھیڑ دیا۔ ہر چھوٹے بڑے مرزائی کی زبان جو قینچی کی طرح چلنے کی خوگر ہے ان غریب کو بھانت بھانت کی گالیاں اور رنگ رنگ کی ملاحیاں سنانے کے لئے وقف ہو گئی۔ لیکن اس سارے سب وشتم کا نچوڑ خلیفہ قادیان مرزا بشیر الدین محمود کا وہ "الہامی" خطبہ ہے جو آپ نے ۲۶۔اپریل ۱۹۳۵ء کو اپنے دربار کے جی حضوریوں کے بھرے مجمع میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں جس کی درازی حسب معمول معلم الملکوت کی آنت کی روداتنی طوالت کو شرمندہ کر رہی ہے۔ آپ نے پہلے کفر اور اسلام کا فرق بتایا یعنی اپنی ذات والاصفات اور اپنی امت قلیل الانفار کو اسلام کا واحد اجارہ دار بتا کر کفر کی گٹھڑی کا سارا ہما لیائی بوجھ مسلمانوں کے مظلوم سر پہ رکھ دیا۔ پھر کلام اللہ کی تغلیط و تحمیق کی طرف متوجہ ہوئے اور اس نص صریح کو سامنے رکھ کر کہ ان اللہ لا یغفر ان یشرک و یغفر من دون ذالک من یشاء۔ اللہ شرک کا گناہ تو کبھی نہ بخشے گا لیکن دوسرے گناہ جو چاہے

بخش سکتا ہے)اُس قرآن شریف کی رو سے جو قادیاں شریف میں نازل ہؤا ہے۔ اعلان فرمایا کہ جنّت کا دروازہ مشرکوں اور دہریوں کے لئے بھی کھلا ہؤا ہے خدائے بزرگ و برتر کے قول کو جھٹلانے کا مقدس قادیانی فرض ادا کرنے کے بعد آپ مرزا سر ظفر علی کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن پر گوناگوں مطاعن اور بوقلموں ملاعن کا جھاڑ باندھ دیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہ فن ہے جس میں آپ سے آج تک اگر کوئی بازی لے جا سکا ہے تو وہ آپ کے آں جہانی باوا تھے۔ اس سارے خطبے کے لفظی اور بین السطوری مفہوم کو اگر کلام موزون میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کوشش کا ماحصل ذیل کے اشعار ہو سکتے ہیں جو بے اختیار زبانِ قلم پر جاری ہو گئے:۔

رسولِ وقت کی اولاد ہم ہیں ۔۔۔ وفادارانِ مادرزاد ہم ہیں

پچاس الماسیاں ہیں قادیاں ہیں ۔۔۔ سبق اُن کا ہے جن کو یاد ہم ہیں

بہشتی مقبرے کی ہڈیوں کا ۔۔۔ تبرک بانٹ کر دل شاد ہم ہیں

پرستارانِ خاکِ کعبہ سُن لیں ۔۔۔ کہ زیبِ مسندِ ارشاد ہم ہیں

نگارستانِ ایماں کی کرو سیر ۔۔۔ کہ اس کے مانی و بہزاد ہم ہیں

جسے اسلام سمجھے ہو وُہ ہے کُفر ۔۔۔ اور اس پر کرنے والے صاد ہم ہیں

پُرانی ہو چکی مکّہ کی تہذیب ۔۔۔ نئی تہذیب کے اُستاد ہم ہیں

فضا گونجی ہے جس کی گالیوں سے

وہ بستی کر رہے آباد ہم ہیں

شریعت بن گئی جن کا کھلونا ۔۔۔ وُہی مادر پدر آزاد ہم ہیں

خدا کا لوگ بیشک کر لیں انکار　　کہ اُن کو دینے والے داد ہم ہیں
نبوت ہے ہمارے گھر کی لونڈی　　خدا کے آخری داماد ہم ہیں
غم استعمار کی دیوار کو کیا　　جب اس دیوار کی بنیاد ہم ہیں
نصاریٰ کی ہری کیوں ہو نہ کھیتی　　کہ اُن کا کھیت ہو اور کھاد ہم ہیں
کوئی جا کر "مسلمانوں" سے کہہ دے　　کریں گے جو تمہیں برباد ہم ہیں
حکومت سے اُلجھتے کس لئے ہو　　پڑی ہے تم پہ جو اُفتاد ہم ہیں

دماغ اُس کا نہ پہنچا جن کی تہ تک
وہ نکتے کر رہے ایجاد ہم ہیں

لاہور
۳ مئی سنہ ۱۹۳۵ء



(۱۵۶)

"زمیندار"

اور

مجلسِ احرار کے اربابِ بست وکشاد

"زمیندار" کی ایک اشاعت میں جناب نسیم سوہدروی کا ایک اپیل شائع ہوا تھا جس میں آپ نے مجلس احرار کے ارباب حل وعقد سے دریافت کیا تھا کہ آپ حضرات نے اسلامیانِ ہند بلکہ اسلامیانِ عالم کے اس دیرینہ خادم کی مشکلات کے ازالہ کے لئے اب تک کوئی قابلِ ذکر عملی اقدام اب تک کیوں نہیں کیا۔ اس سوال کا جواب جناب نسیم کو ملے یا نہ ملے لیکن "زمیندار" کی خودداری سے وہ اپنی محبت بھری التجا کا جواب اگر سُننا چاہیں تو سُن لیں:۔

اے "زمیندار" دم لیا تُو نے ۔۔۔ وعدۂ اوّلیں وفا کر کے
مار کر ایک نعرۂ یاھُو ۔۔۔ رکھ دیا غیر کو جُدا کر کے
دل سے باطل کا ڈر نکال دیا ۔۔۔ حق کا اظہار برملا کر کے
مشکل اسلامیوں کی حل کر دی ۔۔۔ ما سوا اللہ سے ابا کر کے

دیدہ ور کو دکھا دیا تُو نے | تھے جو چھوٹے اُنہیں بڑا کر کے
نام اُچھالا نبیؐ کی اُمّت کا | درد سے دل کو آشنا کر کے
خرمنِ کُفر کو لگا دی آگ | چمن اسلام کا ہرا کر کے
گُل کیا تُو نے قادیاں کا چراغ | روشن ایمان کا دیا کر کے
ناؤ مرزائیوں کی ڈُوب گئی | تُو نے چھوڑا اُسے فنا کر کے
تجھے بخشی گئی حیاتِ ابد | جان اسلام پر فدا کر کے
سربلندی ہُوئی نصیب تجھے | سرفروشی کا حق ادا کر کے
تیری عزّت میں چار چاند لگے | دل و جان نذرِ مصطفٰےؐ کر کے
تجھ کو جو کچھ ملا خدا سے ملا | نہ کہ بندوں سے التجا کر کے
کوئی جا کر نسیم سے کہہ دے | "کیا ملا عرضِ مُدعا کر کے

بات بھی کھوئی التجا کر کے"

لاہور۔ ۱۰۔ جون ۱۹۳۵ء

(۱۵۷)

بلوچستان

کوئٹہ کے قیامت خیز زلزلہ میں خدا کی ہزارہا مخلوق پیوند زمین ہوگئی۔ اس حادثہ میں نواب یوسف علی خاں مگسی کے بھی جاں بحق ہونے کی خبر آئی۔ لیکن ساتھ ہی ایک تار آیا (جو افسوس کہ بالآخر صحیح نہ نکلا) کہ یوسف علی خاں صحیح و سلامت ہیں۔ اس تار کے پہنچنے پر حسب ذیل اشعار بے اختیار زبان پر جاری ہوگئے۔

نہ بھولے گا بلوچستان کا بھونچال یاروں کو
قیامت تھا ہر اک بستی میں اس کا شور مچ جانا

اُترنا اُس کی ہیبت کا دلوں میں اور دماغوں میں
سراپاؤں کے ریشہ ریشہ اور نخ نخ میں رچ جانا

تماشاگاہِ عبرت تھا قضا کے زور بازو کا
جہانِ ناتواں کی نیم جانی سے بلچ جانا

جسے ہم مارنا چاہیں بچا سکتا ہے کون اُس کو
اس ارشادِ خداوندی کو منکر نے بھی سچ جانا

خدا کا سایہ ہو یوسف علی خاں کی طرح سر پہ
تو آساں ہے فنا کی زد میں آنا اور بچ جانا

لاہور۔ ۱۴۔ جون ۱۹۳۵ء

(۱۵۸)

احرار کا جنازہ

مسجد شہید گنج لاہور ۲۲ جون ۱۹۳۵ء کو شہید کر دی گئی۔ اس کے بعد ہی مجھ کو اور مجلس اتحاد ملت کے مختلف ارکان کو مختلف مقامات میں نظر بند کر دیا گیا۔ میری نظر بندی کا مقام کرم آباد میں تجویز ہوا۔ یہ نظم اسیری کے اُنہی ایام کی یادگار ہے۔

اللہ کے قانون کی پہچان سے بیزار — اسلام اور ایمان اور احسان سے بیزار
ناموسِ پیمبرؐ کے نگہبان سے بیزار — کافر سے موالات مسلمان سے بیزار
اس پر ہے یہ دعویٰ کہ ہیں اسلام کے احرار — احرار کہاں کے یہ ہیں اسلام کے غدّار
پنجاب کے احرار — اسلام کے غدّار

بیگانہ یہ بدبخت ہیں تہذیبِ عرب سے! — ڈرتے نہیں اللہ تعالےٰ کے غضب سے!
مل جائے حکومت کی وزارت کسی ڈھب سے — سرکارِ مدینہ سے نہیں اُن کو سروکار
پنجاب کے احرار — اسلام کے غدّار

جا کر کہے اُن سے کوئی اللہ کا بندہ — جب دین کی حُرمت کا گلے میں نہیں پھندا
اور شرع کی تذلیل ہے احرار کا دھندا — پھر کیوں ہیں مسلمان سے چندے کے طلبگار
پنجاب کے احرار — اسلام کے غدّار

کھاتا ہے مسلماں کوئی سینہ میں جو گولی
گالی اُسے دیتی ہے یہ احرار کی ٹولی
اسلامیوں کے خوں سے چلی کھیلنے ہولی
احرار کو پھر آج سے کیوں لکھئے نہ اشرار
پنجاب کے احرار
اسلام کے غدّار

سُوجھی شہدا پر انہیں مردار کی پھبتی
سکھوں کی یہ پھبتی ہے نہ منکر کی پھبتی
توحید کے بیٹو یہ ہے احرار کی پھبتی
گمراہ ہیں خود اور ہیں کہتے ہیں غلط کار
پنجاب کے احرار
اسلام کے غدّار

اللہ کے گھر کو کوئی ڈھادے تو یہ خوش ہیں
مسجد کا نشاں کوئی مٹادے تو یہ خوش ہیں
مُسلم کا کوئی خون بہادے تو یہ خوش ہیں
لاہور میں آثار قیامت ہیں نمودار
پنجاب کے احرار
اسلام کے غدّار

مردانِ مجاہد سے جو اس طرح کٹے ہیں
اللہ کے رستہ سے جو اس طرح ہٹے ہیں
اسلام کی فوجوں کے مقابل جو ڈٹے ہیں
پھر کیوں نہ یہ کمبخت ہوں رُسوا سرِ بازار
پنجاب کے احرار
اسلام کے غدّار

کرم آباد - ۸ - اگست ۱۹۳۵ء

(۱۵۹)

پیغامِ عید

تجھ کو دینے آئی ہے درسِ حیاتِ جاوداں
اے مسلماں کان کھول اور عید کا پیغام سُن

اپنے آبائی شرف کے مشغلے کو تازہ رکھ
طنطنے اپنی جہانگیری کے صبح و شام سُن

اے حرم کے پاسباں توحید کا ڈنکا بجا
پھر حریفوں سے حدیثِ گردشِ ایام سُن

مغربی رامشگروں کے زمزمے سُنتا ہی کیا
اپنی محفل گرم کر اور نغمۂ اسلام سُن

ہی تہیدستی مسلمانوں کی پہچاں آج کل
کچھ بھی غیرت ہی تو غیروں سے نہ یہ الزام سُن

غیر کا محکوم ہونا گر نہیں تجھ کو پسند
قبلہ رُو ہو اور خدا کے سرمدی احکام سُن

نعرۂ تکبیر سے دُنیا میں ہلچل ڈال دے
جس کو لیں مشرق اور مغرب کے سب اصنام سُن

لاہور۔ یکم مارچ ۱۹۳۶ء

(۱۶۰)

نوبہار

یہ مژدہ سنایا ہے مرغِ سحر نے کہ طرفِ چمن سے خزاں جا رہی ہے
ہجومِ گل و لالہ و یاسمن میں خراماں خراماں بہار آ رہی ہے
ہری ہو رہی ہیں درختوں کی شاخیں نظر شانِ پروردگار آ رہی ہے
گہر ہائے غلطاں کا آویزہ شبنم بناگوشِ سنبل میں لٹکا رہی ہے
جگایا ہے سبزہ کو موجِ صبا نے نسیم آ کے لالہ کو مہکا رہی ہے
شہِ خاوراں کی شعاعِ زرافشاں زمیں پر نیا نور پھیلا رہی ہے
نئی فصل کی کہربائی حرارت رگوں میں نیا خون دوڑا رہی ہے
ہوائیں نشیلی فضائیں رنگیلی بہار اپنی تصویر کھنچوا رہی ہے
ہوا ختم پرہیزگاری کا موسم سیہ مستیوں کی گھٹا چھا رہی ہے
تہی کیسہ رندوں کے بے مایہ گھر میں شراب آ رہی اور ادھار آ رہی ہے

جواں ہو رہا ہے جنوں ایشیا کا　　یہ آندھی جو اُٹھی ہے بڑھا رہی ہے
مسلماں کے بازو کی دیرینہ قوّت　　زمانہ کا نقشہ بدلوا رہی ہے
عجم کی اُمنگوں میں شرکت عرب کی　　نئی زندگی کی خبر لا رہی ہے
رہِ حق میں سر بیچنے کی تمنّا　　ہر اک مردِ مومن کو تڑپا رہی ہے
اتاترک کی صولتِ ضیغم افگن　　صلیبی حریفوں کو لرزا رہی ہے
خدا کی ستم کش نوازی کی عادت　　ستمگر کی گردن کو نیوڑھا رہی ہے
پیمبر کی رحمت دو عالم پہ چھا کر　　پرایوں اور اپنوں کی غم کھا رہی ہے

بہار آفریں ہے یہ نظمِ مرصّع
جسے ساری خلقِ خدا گا رہی ہے

۱۱۔ مارچ ۱۹۳۶ء

(۱۶۱)

مجلسِ اتحادِ ملّت کے اغراض و مقاصد

یہی مقصد ہے اے مسلمانو مجلسِ اتحاد ملّت کا

ہو سرافراز اُمّتِ مرحوم ختم ہو دَور اس کی ذلّت کا

اپنی فطرت کا تذکرہ کیجے نہ کہ اغیار کی جبلّت کا

مسجدیں ہی نکھار سکتی ہیں رنگ حُرمت کا اور حِلّت کا

آپ کثرت پہ غالب آئیں گے فکر کیجے نہ اپنی قلّت کا

قوم جو سو رہی ہے اُٹھ بیٹھے
گر نکل جائے حرف علّت کا

یکم اپریل ۱۹۳۶ء

(۱۶۲)

امرتسر کے نیلی پوش

یہ شور اُٹھا کہ امرت سر کے نیلی پوش آ پہنچے
کفن باندھے ہوئے سر سے شہادت کوش آ پہنچے

ہیں جن کی عافیت سوزی کے چرچے آج کل گھر گھر
وُہ مردانِ مجاہد عاقبت بر دوش آ پہنچے

ہُوئی فرزانگی پر خندہ زن دیوانگی جن کی
وُہ دیوانے لُٹانے کو متاعِ ہوش آ پہنچے

حریصِ لذّتِ آزار کوئی ہو تو ایسا ہو
جنھوں نے نیش کو سمجھا ہمیشہ نوش آ پہنچے

خُدا کے گھر کے رکھوالے مئے بطحا کے متوالے
ہے جن کا مُنتظر فردوس کا آغوش آ پہنچے

وُہ آ پہنچے ہیں بن کر موج لُطفِ ربِّ اکبر کی
وُہ ہو کر مُصطفائی رحمتوں کا جوش آ پہنچے

۳- اپریل ۱۹۳۶ء

(۱۶۳)

مدرسۃ البنات جالندھر

ہے یہی اوّلیں سبق مدرسۃ البنات کا
نام زمانہ میں اُچھال سرورِ کائنات کا

فرش پہ گفتگو تری عرش کو جُستجو تری
رشتہ ہے کس قدر دراز تیرے تعلّقات کا

وضعِ عرب کر اختیار تاکہ چھا سکے نہ رنگ
تیرے مزاج پر عجم اپنے تکلّفات کا

تجھ سے لیا ہو انتقام آج شہید گنج میں
برہمنوں کی رُوح نے ہیکلِ سومنات کا

دَیر سے کٹ حرم سے جُڑ ایک خدا سے لو لگا
قصّہ ہُبل کا پاک کر توڑ طلسم لات کا

روزہ بھی ہو نماز بھی حج بھی ہو اور زکات بھی
لُبِّ لباب ہے یہی فلسفۂ حیات کا

۲-اپریل ۱۹۳۶ء

(۱۶۴)

فرزندانِ توحید کی روش

ہے سلطنت کی آرزو تو مصطفےٰ کمال بن
ہلال کا عروج ہو صلیب کا زوال بن

ضعیف اگر نظر پڑے رسول کا جمال بن
قوی اگر ہو سامنے تو قہرِ ذوالجلال بن

خدا کے آگے سر جھکا کہ سرکشوں کا سر جھکے
قضا ستمگروں کی ہو ستم زدوں کی ڈھال بن

وطن کے ساتھ دین بھی اگر تجھے عزیز ہے
جو بن گیا ہے پہلوی تو ساتھ ہی بلال بن

اگر ہے جستجو تجھے طنابِ اتحاد کی
تو نجدیوں کے تاج کا گہر فشاں عقال بن

ہے تو خدا کے واسطے خدا ہی تیرے واسطے
چلا ہی اُس کی راہ میں تو پھر اُسی کی چال بن

قلم سے کام تیغ کا اگر کبھی لیا نہ ہو
تو مجھ سے سیکھ لے یہ فن اور اس میں بے مثال بن

۱۰-۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء

(۱۶۵)

نیپال

یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو میں نے حسب ذیل برقیہ وزیر اعظم نیپال کے نام بھیجا: "جنک پور میں حکومت نیپال کے عمال کے ہاتھوں مسجد کے انہدام، مقدمہ چلائے بغیر مسلمانوں کو جیل میں ٹھونس دینے اور اُن کی جائدادوں کی ضبطی عام اور ان کی مذہبی آزادی سلب کر لئے جانے پر تمام اسلامی ہند میں ہیجان و اضطراب کی لہر دوڑ گئی ہے۔ میں آپ کی حکومت کی انصاف پسندی سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ صورت حال کو پُر سکون بنانے کے لئے فوری اقدام کرے گی۔" نظم ذیل انہی واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئی :-

سُنا ہے چند دن سے مُبتلا ہیں — مصیبت میں مسلمانانِ نیپال

انہیں ہر طرح کے دُکھ دے رہے ہیں — حکومت کے تشدّد پیشہ عمال

خدا کا نام لینے کی خطا پر — سلامت اُن کی جانیں ہیں نہ اموال

ذرا بولے تو ڈھا دی اُن کی مسجد — اور اس کے بعد زنداں میں دیا ڈال

خدا اُس ہاتھ کو شرمائے جس نے — قفس والوں کے نوچے ہیں پر و بال

یہ سب کچھ دیکھ کر آتا نہیں کیوں — خداوندا تری غیرت کا بھونچال

اگر تو ڈھیل دینا چاہتا ہے — انہیں جن کے مظالم کا ہے یہ حال

پیمبرؐ ہی کی رحمت کا تصدّق — مسلمانوں کی ساری مشکلیں ٹال

۲ مئی ۱۹۳۶ء

(۱۶۶)

مسجد شہید گنج کی شہادت

پر

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے دو رسمی آنسو

۱۲- اپریل ۱۹۳۶ء کو سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجلس احرار کی طرف سے مقدمہ مسجد شہید گنج کی کامیابی کے لئے دعا کا اعلان کیا۔ حالانکہ مسجد کی شہادت میں بڑا ہاتھ مسلمانوں سے احرار کی علیحدگی کا تھا۔ اس پر اشعار ذیل بے ساختہ زبان پر جاری ہوگئے:-

بے سُود ہے دُعا نہ ہو جب تک عمل بھی ساتھ
میں نے پڑھا ہے یہ درس اُحد کی کتاب سے

لُطفِ فرنگ پہ ہی بھروسہ رہا جنہیں
کیا مانگتے ہیں پھر وہ خدا کی جناب سے

قانون ہے وہی جسے جاری کرے خدا
ہم سُنتے آئے ہیں یہی اُم الکتاب سے

غافل کے آنسوؤں سے وہ کھیتی ہو بے نیاز
سینچا ہو احمقوں نے جسے خونِ ناب سے

گینتی[1] کی ضرب اور ہے خامہ کی ضرب اور
کہہ دے کوئی جنابِ شریعت مآب سے

احرار کے گناہ کو یارب معاف کر
ان کو بچا عقوبتِ روزِ حساب سے

---

[1] بادشاہی مسجد لاہور میں مقدمہ مسجد شہید گنج کی کامیابی کے لئے دست دعا بلند کرنے سے پہلے اپنی تقریر میں مولانا عطاء اللہ شاہ نے یہ فقرہ ارشاد فرمایا کہ مسجد جب گینتیوں سے گرائی جا رہی تھی تو گینتی کی ہر ضرب مسجد کی چھت پر نہیں بلکہ حقیقت میں اُن کے سینہ پر پڑتی تھی۔

(۱۶۷)

روما کا خطاب لندن سے!

مَیں نے برطانیہ کے نقشِ قدم پہ چل کر
حبشستاں میں کیا پرچمِ تہذیب بلند

مَیں نے گوروں کی روایات کو قایم رکھا
ڈال کر کالوں کی گردن میں غُلامی کی کمند

مَوت کے گھاٹ اُتارا اُنہیں مَیں نے بیشک
یہ سمجھ کر کہ ہے یورپ کو یہی چال پسند

حبشی وحشیوں کے گھر کو اُجاڑا مَیں نے
کہ بسیں آکے یہاں میرے مہذب فرزند

جانتا ہوں کہ گِلہ اُن کو ہی مجھ سے، لیکن
یہ وہی شکوہ ہے جو کرتے ہیں تم سے ہمند

نہیں تم کو تو یہ لازم کہ مجھے طعنے دو
"ایں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند"

۱۵۔ اپریل ۱۹۳۶ء

(۱۶۸)

تاجدارِ مدینہ کے غلاموں کی شان

کس کی مجال ہے کہ انہیں کہہ سکے رذیل
جب اُن کے گھر میں نقرہ و زر کا دفینہ ہے

سفلے تو آج کل ہیں وہی واژگوں نصیب
ہر روز جن کو حاجتِ نانِ شبینہ ہے

پیسوں سے اُن کی جیب جو ہوتی بھری ہوئی
کہتے وہ پھر یہ کیوں کہ مسلماں کمینہ ہے

جو آنکھ ہی ہم اُس میں کھٹکتے ہیں مثلِ خار
جو سینہ ہے ہمارے لئے پُر ز کینہ ہے

تیر افگنی کی خالصہ جی کر رہے ہیں مشق
آماج گاہ کے لئے حاضر یہ سینہ ہے

ہیں لالہ جی بھی خالصہ جی کے رفیقِ کار
آزادیٔ وطن کا یہ اچھا قرینہ ہے

شاید خبر نہیں یہ ہمارے حریف کو
ہم جس کے ہیں غلام وہ شاہِ مدینہ ہے

تہذیبِ یثربی کی مسلماں سے ہی نمود
انگشتری وہ ہے تو یہ اُس کا نگینہ ہے

اے ربِّ کعبہ بھیج ہوائیں نجات کی
طوفاں بپا ہے اور بھنور میں سفینہ ہے

۱۶- اپریل ۱۹۳۶ء

(۱۶۹)

کعبہ اور اُس کی بیٹیاں

مرکزِ توحید پہلے دن سے ہے بیت الحرام — مشرق و مغرب میں ہے پھیلا ہوا جس کا نظام

بیٹیاں کعبہ کی ہیں سارے جہاں کی مسجدیں — گھر ہیں تہذیبِ حجازی کا ہماری مسجدیں

نازل اس گھر میں ہوئیں دونوں جہاں کی رحمتیں — حضرتِ پیغمبرِ آخر زماں کی رحمتیں

آدمی آغوشِ یزداں میں پلا آکر یہاں — نُور کے سانچے میں یہ پُتلا ڈھلا آکر یہاں

نسلِ آدم کے شرف کا راز کُھلتا ہی یہیں — اُس کی پیشانی پہ تھا جو داغ دُھلتا ہی یہیں

نام ہوتا ہے اسی گھر سے بلند اللہ کا — فرق مٹتا ہے یہیں آکر گدا و شاہ کا

ناتوانوں کو توانائی اسی گھر سے ملی — دردمندوں کو مسیحائی اسی گھر سے ملی

جبر و استبداد کی فوجیں رکیں آکر یہیں — گردنیں کسریٰ و قیصر کی جُھکیں آکر یہیں

امن کا انعام دلوایا اسی گھر سے گیا — صُلح کا پیغام پہنچایا اسی گھر سے گیا

بزمِ گیتی کی ضیا اس گھر کی آبادی سے ہے — اسود و احمر کی رونق اس کی آبادی سے ہے

جس کے دل میں آئے گا اس گھر کے ڈھانے کا خیال
خاک میں اُس کو ملا دے گا محمدؐ کا جلال

۱۷ اپریل ۱۹۳۶ء

(۱۷۰)

زمیندار کی تعلیم

آزادیٔ کامل کا ہے جوئندہ زمیندار
جوئندہ ہی جب کیوں نہ ہو یابندہ زمیندار

اس قول پہ ہیں متفق اسلام کے فرزند
ہے ملتِ بیضا کا نمائندہ زمیندار

بدلی ہے نہ بدلے گی مدینہ کی گورمنٹ
اور ہے اسی سرکار کا کارندہ زمیندار

باطل کے ہرانبوہ کو بتیس برس سے
کرتا چلا آیا ہے پراگندہ زمیندار

کیوں کفر کی آنکھوں میں نہ آجائے چکاچوند
ایمان کی ہے مشعلِ رخشندہ زمیندار

دل جس کے لئے تار بنا جان بنی پود
اُس حلۂ زیبا کا ہے بافندہ زمیندار

تثلیث کے کوچوں میں گدائی نہیں کرتا
توحید کی گلیوں کا ہے خواہندہ زمیندار

جب اُس کے لئے غیب کے کھل جائیں خزانے
کیوں غیر کے احساں کا ہو شرمندہ زمیندار

اسلام سے وابستہ ہوئی زندگی اس کی
اسلام کی مانند ہے پایندہ زمیندار

عشاقِ نبیؐ کو کبھی موت آنہیں سکتی
پھر کیوں نہ رہے تا بہ ابد زندہ زمیندار

جو مانگیں مسلماں فقط اللہ سے مانگیں
دے گا یہی تعلیم انہیں آیندہ زمیندار

سنہ ۱۹۳۶ء
۱۹ اپریل

(۱۷۱)

قدرت کے کھیل

یاد اُن دنوں کی لیتی ہے پہلو میں چٹکیاں جب تھی ہمارے گھر میں بھی دولت کی ریل پیل

جب ہم تھے نہی وامر کے اُشتر کے ساربان اور تھی ہمارے ہاتھ میں اس اونٹ کی نکیل

پانچوں تھیں گھی میں پڑھتے تھے جب وہ فارسی انگریزی آج پڑھتے ہیں اور بیچتے ہیں تیل

گر پھاگ کھیلتے ہیں لنگوٹی میں اہل ہند قدرت کے بائیں ہاتھ کا ہے یہ بھی ایک کھیل

ہندو بھی ہے ذلیل مسلماں بھی ہے ذلیل دونوں کے دونوں ہو گئے اغیار کے دہیل

ہندو کو ہے یہ حکم کہ مرکر بھی دم نہ مار اور بول دی گئی ہے مسلمان کی دلیل

نقارہ جن کے نام کا بجتا تھا رات دن آبادُ سے آج ہیں ہندوستاں کے جیل

خواب و خیال ہو گئی آزادیٔ وطن چڑھتی ہمیں نظر نہیں آتی منڈھے یہ بیل

ہمکا دیا ہے جس نے چھچھوندر کے سر کو آج مشرق کے کنٹروں میں ہے وہ مغربی پھلیل

پشیمانیوں سے دور ہوں رسوائیوں کے داغ
شیخ اور برہمن کا اگر آج بھی ہو میل

۲۱ - اپریل ۱۹۳۶ء

(۱۷۲)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایک سوال

اس سوال کا محرک ڈاکٹر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا وہ بے تابانہ بیان تھا۔ جس میں آپ نے اعلان کیا کہ یونیورسٹی کے طلبہ نے مسٹر سبھاش چندر بوس کی گرفتاری پر کوئی احتجاجی جلسہ نہیں کیا:۔

آتا نہیں ہے یاد اُنہیں عہدِ الست کیوں — کل تک جو ہوشیار تھے ہیں آج مست کیوں

حق کا عَلَم بلند ہُوا جس کے ہاتھ سے — باطل سے کھا رہی ہے وہ ملّت شکست کیوں

آغوشِ عرش میں ہُوئی تھی جس کی پرورش — وہ ہمّتِ بلند ہوئی آج پست کیوں

اربابِ حل و عقد کی قوّت کدھر گئی — چھینا گیا ہے اُن سے کشاد و بست کیوں

ہندوستاں میں کیوں ہیں مسلماں ذلیل و خوار — جو چیرہ دست تھے وہ ہوئے زیر دست کیوں

ہسپانیہ سے جس نے ملایا تھا چین کو — پھر ایک بار ہم نہ لگائیں وہ جست کیوں

شاید جواب اس کا علی گڑھ ہی دے سکے
اب ہیں خدا پرست حکومت پرست کیوں

۲۲-اپریل ۱۹۳۶ء

(۱۷۳)

مسجدِ انگور راولپنڈی

۲۸-اپریل کو مجھے راولپنڈی جانے کا اتفاق ہوا جہاں میں نے مسجد انگور میں مولانا محمد اسحاق مانسہروی کے ہاں قیام کیا مسجد کے ساتھ ایک چھوٹا سا کوشک ہے جس پر انگور کی بیلیں چھائی ہوئی ہیں اسی مناسبت سے مسجد کا نام مسجد انگور ہے۔ یہ بارونق مسجد جہاں قرآن و حدیث کا درس بھی دیا جاتا ہے۔ مولانا کی سالہا سال کی جانکاہیوں کا نتیجہ ہے مسجد میں بہت سے صاحب ذوق احباب جمع تھے جن کی فرمائش پر اشعار ذیل زبان پر آگئے

چلتا ہے یہاں بادۂ توحید کا ساغر　　کہتے ہیں فرشتے اسے انگور کی مسجد

ہیں منبر و مینار سے سو طور نمودار　　پھر کیوں نہ کہیں ہم کہ یہ ہے نور کی مسجد

ہیں اس کے نمازی رسن و دار کے شیدا　　ہے معنیٔ اصلی میں یہ منصور کی مسجد

اسحاق کو اللہ حیاتِ ابدی دے　　ہے یہ اسی اللہ کے منظور کی مسجد

قیصر کا یہ معبد ہے نہ فغفور کا ہیکل

مشہور ہے دنیا میں یہ مزدور کی مسجد

۲۸-اپریل ۱۹۳۶ء

(۱۷۴)

بلالستان

۷۔ مئی ۱۹۳۶ء کے "زمیندار" میں مَیں نے ایک افتتاحیہ سپردِ قلم کیا تھا۔ جو ان الفاظ پہ ختم ہُوا:۔

گوری رنگت والے مغربیوں نے اس ڈر سے کہ ایک کالی کلوٹی قوم کو جنگی کمک پہنچانے کا نتیجہ کہیں خانہ جنگی کی شکل میں نہ نکل آئے اس قوم کو اطالوی استعمار کی اُلٹی چھری سے ذبح ہو جانے دیا۔ لیکن اگر قانونِ مکافات دُنیا سے ناپید نہیں ہُوا تو وُہ دن دُور نہیں جب حبشہ کی خوں چکاں نعش کا بدلہ اٹلی کی سفاکی سے لیا جائے گا اور دُنیا مغربی تہذیب کے بسملانہ رقص کا تماشا انشاء اللہ اپنی آنکھوں دیکھے گی۔

قانونِ مکافات نے ۱۹۴۱ء سے پہلے ہی اپنا رنگ دکھایا۔ اٹلی سے اس کی سفاکانہ دستبرد کا بدلہ لیا جا رہا ہے۔ اور دُنیا یورپین تہذیب کے بسملانہ رقص کا تماشا بھی اپنی سینما میں دیکھ رہی ہے۔ ذیل کی نظم بھی ۷۔ مئی ۱۹۳۶ء کو ہی سپردِ قلم کی گئی تھی:۔

یہ جا کر کوئی کہہ دے مغربی کشور کشاؤں سے — کہ ہے بے سُود اُلجھنا ربِّ اکبر کی قضاؤں سے

بہا لے جا چکی ہے بارہا باطل کو رَو جس کی — وہ دریا پھر اُبلنے کو ہے بطحا کی گھٹاؤں سے

نجاشی کے وطن پر سایۂ لطفِ پیمبر ہے
نہ ٹکرائے بلالستان کی کالی بلاؤں سے

اثر پھر چھیننے والا ہے محمدؐ کی دعاؤں کا
اڑو وا کی طرح اڈیس ابابا کی فضاؤں سے

ہلا دی تھیں جنہوں نے روضۃ الکبریٰ کی بنیادیں
مسولینی کی ٹکر ہے پھر ان تیغ آزماؤں سے

زمیں کر دی گئی تھی تنگ جن کی ترکتازی پہ
اماں اب مانگی جاتی ہے انہیں کوتہ قباؤں سے

عرب کا اور عجم کا رشتہ ربِّ کعبہ نے جوڑا
بغلگیر آشنا پھر ہو رہے ہیں آشناؤں سے

گدا نے شاہ کو ہر مرتبہ نیچا دکھایا ہے
ہوئی ہے جب کبھی شاہوں کی آویزش گداؤں سے

سلیقہ سیکھنا ہو بم گرانے کا نہتوں پہ
تو جا کر سیکھ لو یورپ کے جنگی دیوتاؤں سے

وہ نافرجام بیڑا ڈوبنے سے بچ نہیں سکتا
خدا کا ساتھ چھوٹا جس کے خود بیں ناخداؤں سے

لاہور۔ ۷ مئی ۱۹۳۶ء

(۱۷۵)

ڈاکٹر مختار احمد انصاری رحمۃ اللہ علیہ

رونقِ کاشانۂ اسلام انصاری سے تھی　　مستی خمخانۂ اسلام انصاری سے تھی

گرمیِ ہنگامۂ احرار کہتے تھے اُسے　　لشکرِ حق کا علم بردار کہتے تھے اُسے

اُس کے پیکر کا خمیر مایہ تھی خاکِ حرم　　گردن اُس کی سامنے باطل کے ہوتی تھی نہ خم

وہ عرب کا راہ رو تھا اور عجم کا رہ نورد　　کوئی بھی میدان تھا ایسا نہ تھا جس کا وہ مرد

ترک کا دل انقرہ سے چھین کر لایا کبھی　　محفلِ دہلی کو اُٹھ کر اُس نے گرمایا کبھی

اُس کے ماتم میں سیہ پوش آج ہیں ہندوستاں　　اُس کے غم میں ہے وطن سارا نوا سنجِ فغاں

زندہ رکھنا چاہتے ہو تم گر اُس کے نام کو
ہے یہ شکل اس کی کہ رکھو جاری اُس کے نام کو

لاہور - ۲۰ - مئی ۱۹۳۶ء

(۱۷۶)

امیرِ شریعتِ احرار کے مواعظِ حسنہ

فرماتے ہیں شریعتِ احرار کے امیر
برطانیہ غنی ہے اور اللہ ہے فقیر

اس مُلک میں ہیں سلب خدا کے سب اختیار
حاشا کہ ربِّ کعبہ نہیں ہند میں قدیر

خالی ہُوا ہے ترکشِ تقدیرِ ذوالجلال
باقی نہیں بچا کوئی اس میں قضا کا تیر

امرِ محال ہے یہ کہ مسجد ہو واگزار
برطانیہ کا فیصلہ پتھر کی ہے لکیر

مسجد شہید گنج کی ہے مسجدِ ضرار
جو اس کا نام لے وہ منافق ہے یا شریر

ابنِ سعود کیا ہے؟ فقط اک حرم فروش
برطانیہ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر

اسلامیوں پر اُس نے برسوائیں گولیاں
پھر کیوں نہ کشتنی ہو "زمیندار" کا مدیر

جو ضد ہے اس کو ہم سے وُہ آئی ہے سونپ کر
مرزائیوں کو دولتِ آزادیٔ ضمیر

قارورہ قادیانیوں سے اس کا مِل گیا
ہے آج سے مرید یہ اُن کا وُہ اس کے پیر

ہم کونسلوں میں جائیں گے یہ مسجدوں میں جائے
دیبا ہمارے واسطے اُس کے لئے حصیر

مِلّت کا اتحاد ہے اک ہیکلِ فریب
جس کی صلائے عام ہے شیطان کی نفیر

جب تک نہ ہوں گے سارے یہ اسرار بے نقاب
احرار بن سکیں گے نہ پنجاب کے وزیر

۲۳ مئی ۱۹۳۶ء

(۱۷۷)

دُرہائے ناسُفتہ

سُنتے ہیں کہ پنجاب میں ہی بربسرِ پرخاش
اللہ کے قانون سے انگریز کا قانون

اللہ کا قانون ہے قانونِ محمدؐ
انگریز کا قانون ہے پرویز کا قانون

مسجد کی حقیقت کو وہ اب تک نہیں سمجھے
توحید کا جس میں ہو بسیرا یہ وہ گھر ہے

یہ گھر جو ہو برباد تو آجائے قیامت[1]
تثلیث پرستوں کو کچھ اس کی بھی خبر ہے

---

[1] ۱۹۳۶ء میں جو لوگ اس قیامت کے قیام کے منکر تھے وہ آج کہ ۱۹۴۱ء کا دورہ ہے دیکھ رہے ہوں گے کہ یہ قیامت مسجد شہید گنج کے ڈھا دینے والوں کے سروں پہ کس طرح ٹوٹ رہی ہے۔ فافہم و تدبر!

دعویٰ تھا مسلماں کو حیاتِ ابدی کا
مغرب نے یہ پوچھا کہیں کیا اس کے دلائل
مسجد سے نکلتے ہی مسلماں نے پکارا
سُن لو کہ میں ہوں خنجرِ تسلیم کا گھائل

تم کو ہے یہ منظور کہ مسجد کو مٹا دو
منظور خدا کو بخدا اور ہی کچھ ہے
لندن نے سُنایا ہے تمہیں فیصلہ اپنا
اور ہم نے مدینہ سے سُنا اور ہی کچھ ہے

یورپ کے سراپردہ سے عُریاں نکل آئی
بازار میں کرتی ہوئی رقص آپ کی تہذیب
ہم نکلے ہیں پہنے ہوئے توحید کا کنٹوپ
اور آپ کی تہذیب ہے کنٹاپ کی تہذیب

۲۸ مئی سنہ ۱۹۳۶ء

(۱۷۸)

میثاقِ گجرات

واقعہ شہید گنج نے عامۂ مسلمین اور مجلس احرار کے درمیان شدید اختلافات کی جو گہری خلیج حائل کر رکھی تھی اُس پر چند خیر اندیش مسلمانوں نے افہام و تفہیم سے مصالحت کا پُل باندھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مجلس اتحادِ ملت اور مجلس احرار کے سربرآوردہ نمایندوں کا ایک اجتماع گجرات میں ہُوا اور دونوں جماعتوں نے صلح کے ایک میثاق پر اپنے اپنے دستخط ثبت کر دئے۔ جس میں جانبین نے اقرار کیا کہ آیندہ کے لئے ہم مل کر کام کریں گے اور مسجد شہید گنج کے عقدہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے گی جو ملت کے افتراق کا باعث ہو۔ لیکن ہنوز اس عہد نامہ کی سیاہی کاغذ پر خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ احرار نے اس میثاق کے پُرزے اُڑا دئے اور پھر اُسی خانہ جنگی کا بازار گرم کر دیا جس کی حرارت نے احرار کے منقل میں پرورش پائی تھی۔ میثاقِ گجرات کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اُڑانے کا شرف امیرِ شریعت احرار مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو نصیب ہُوا۔ ان دھجیوں کی اُڑان کی سیر ذیل کی نظم میں کیجئے:۔

سر بازار اچھلتی ہم نے دیکھیں پگڑیاں اپنی
پڑا ہے جب سے پالا فتنۂ احرار سے ہم کو

خدا کے گھر کی بربادی پہ جب خوں آنکھ سے ٹپکا
تو روکا بڑھ کے دل کے درد کے اظہار سے ہم کو

بڑھایا آشتی کا ہاتھ جب اُن کی طرف ہم نے
جواب اس کا ملا تلوار کی جھنکار سے ہم کو

ہماری جیت میں ہی راز اُن کی موت کا پنہاں
پیامِ زندگی پہنچا ہی اُن کی ہار سے ہم کو

سیاست اس کو کہتے ہیں کہ چھپ کر گھر میں جا بیٹھے
لڑا کر جنگ کے میدان میں سرکار سے ہم کو

اگر ڈر ہی تو ہی احرار کی مسلم نمائی کا
کوئی طاقت ڈرا سکتی نہیں کفار سے ہم کو

اُڑائیں دھجیاں گجرات کے میثاق کی جس نے
خداوندا بچا اس وضع کے غدار سے ہم کو

۲۰ جون ۱۹۳۶ء

